درسِ قرآن

استادِ شہید مرتضیٰ مطہری

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۱۴۰۲ھ

CULTURAL CENTRE OF THE ISLAMIC REPUBLIC
Road, Karachi

۱/۱۸
۳۶۲۷۱۵
دخان/
۱۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

درسِ قرآن

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران-کراچی
شماره دیویی: ....
شماره ثبت: ۵۶۸۷
تاریخ ثبت: ۱۳۸۷/۱۲/۴

یکے از مطبوعات
دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان
۲-بی-۵/۴ — ناظم آباد نمبر ۲ — کراچی

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ---------- درسِ قرآن

اثر ---------- استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ ---------- محمد خالد فاروقی

کتابت ---------- سید جعفر صادق

ناشر ---------- دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع اوّل ---------- شوال ۱۴۰۷ھ - جون ۱۹۸۷ء

تعداد ---------- ۲۰۰۰

طبع دوم ---------- محرم ۱۴۱۲ھ - جولائی ۱۹۹۱ء

تعداد ---------- ۱۰۰۰

طبع سوم ---------- شوال ۱۴۱۵ھ - مارچ ۱۹۹۵ء

تعداد ---------- ۲۰۰۰

فہرست

○ عرضِ ناشر ۔۔۔۔۔ ۷

○ عربی زبان سیکھنے کی اہمیت وضرورت ۔۔۔۔۔ ۱۱

○ بسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ۔۔۔۔۔ ۲۶

○ خدا کے نام کے ساتھ ہر کام کی ابتدا ۔۔۔۔۔ ۲۷

○ اللّٰہ ۔۔۔۔۔ ۳۰

○ اللّٰہ کا ترجمہ ۔۔۔۔۔ ۳۲

○ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ۔۔۔۔۔ ۳۳

◁ **سورۂ فاتحہ** ۔۔۔۔۔ ۳۷

○ حمد خدا کے لیے مخصوص ہے ۔۔۔۔۔ ۴۰

○ نظری توحید اور عملی توحید ۔۔۔۔۔ ۵۳

○ لفظ عبادت کا مآخذ ۔۔۔۔۔ ۵۹

○ شرک اور توحید ۔۔۔۔۔ ۶۰

○ — عبادت کا اختصاص — ۶۵
○ — جمع کا صیغہ — ۶۶
○ — پہلا طبقہ — ۷۷
○ — دوسرا طبقہ — ۷۷
○ — تیسرا طبقہ — ۷۸
◁ — سورۃ بقرۃ — ۸۱
○ — سورہ کی وجہ تسمیہ — ۸۱
○ — حروف مقطعہ — ۸۲
○ — نماز قائم کرنا کیا ہے؟ — ۹۵
○ — کیا انفاق صرف مال ہی سے ہو سکتا ہے؟ — ۹۶
○ — فلسفۂ انفاق — ۹۷
○ — "انذار" اور "تخویف" کا لطیف فرق — ۱۰۴
○ — مقدس کفر — ۱۰۸
○ — نفاق کیا ہے؟ — ۱۱۳
○ — منافقوں کی خصلتیں — ۱۲۶
○ — "ناس" کا مفہوم — ۱۲۷
○ — قرآن کا نظریہ — ۱۴۳
○ — اصالت حق ہی کی ہے — ۱۴۵
○ — قرآن کے مخاطبین — ۱۶۳
○ — توحید کا پیغام — ۱۶۸
○ — شرک اور توحید — ۱۷۰

○ —— معجزہ سے انکار کرنا قرآن سے انکار کرنا ہے۔ ۱۷۵
○ —— لفظ "معجزہ" —— ۱۷۵
○ —— قرآن نے "معجزہ" کو "آیت" کیوں کہا ہے ؟ —— ۱۷۶
[۱] —— معجزہ کیا ہے ؟ —— ۱۷۸
[۲] —— کیا معجزہ ممکن ہے ؟ —— ۱۸۱
[۳] —— کیا معجزہ واقع ہو سکتا ہے —— ۱۸۷
[۴] —— معجزہ کیسے مدعی کی صداقت کی دلیل بن سکتا ہے ؟ ۱۸۹
◁ —— قراردادی دلالت —— ۱۸۹
◁ —— طبیعی دلالت —— ۱۹۰
◁ —— عقلی دلالت —— ۱۹۱
[۵] —— پیغمبر اسلام کے معجزات —— ۱۹۴
◁ —— پہلی بات —— ۱۹۸
◁ —— دوسری بات —— ۲۰۱
[۶] —— قرآن کا معجزہ —— ۲۱۱
◁ —— اعجاز قرآن کی وجوہات —— ۲۱۵
◁ —— سورہ انشراح —— ۲۳۱
◁ —— سورہ قدر —— ۲۶۳
◁ —— سورہ زلزال —— ۲۸۳
◁ —— سورہ عادیات —— ۲۹۵
◁ —— سورہ عصر —— ۳۰۵

پیغمبرِ اسلام
حضرت محمد مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یاد رکھو ______ !
تم میں سے جو کوئی قرآن کی تعلیم

حاصل کرے گا
اور
اسے دوسروں کو سکھانے کے علاوہ

اس پر عمل پیرا بھی ہوگا
میں اُسے
اپنے ساتھ جنت میں لے کر جاؤں گا۔"

عرضِ ناشر

انقلابِ اسلامی ایران کی اپنے لہو سے آبیاری کرنے والے عاشقانِ خدا کا تصور جب ذہن میں آتا ہے تو ایک چہرہ بہت نمایاں ہو کر ذہن کے پردوں پر اجاگر ہوتا ہے جس کی شمع حیات گل کر کے شاید دشمنوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انھوں نے شہید مرتضیٰ مطہری کو ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ لیکن شہید مطہری آج بھی زندہ ہیں اور علم کی جو شمع اس شہید نے روشن کی تھی، اس کی ضیا، آج بھی چہار دانگ عالم کو منور کیے ہوئے ہے۔

کون ہے جو آج آیت اللہ استاد شہید مطہری کے نام سے واقف نہ ہو یہ عظیم شخصیت انقلاب اسلامی کی جد وجہد میں ہمیشہ اگلی صفوں میں مبارزہ آزما رہی اور کون سے مصائب اور مشکلات ہیں جن کا مردانہ وار مقابلہ اس عظیم مرد مجاہد نے نہ کیا ہو۔ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد آپ نے اسلامی جمہوریہ ایران

کی دستور ساز کونسل کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

آپ قائد انقلاب اسلامی حضرت امام خمینی مدظلہ العالی کے محبوب شاگردوں میں بھی رہے اور قریب ترین ساتھیوں میں بھی۔ امام خمینی کے نزدیک آپ کی اہمیت اور بلند پایگی کا اندازہ اس ایک جملہ ہی سے عیاں ہے کہ جو آپ نے استاد مطہری کی شہادت کے موقع پر نہایت گلوگیر آواز میں فرمایا:

"میں اپنے ایک عزیز فرزند سے محروم ہو گیا ہوں۔ میں اس شخص کی موت کا سوگ منا رہا ہوں جو میری زندگی کا حاصل تھا"

استاد مطہری، تہران میں مختلف النوع مجالس میں عوام کے مختلف طبقوں کو ہفتہ وار یا ماہانہ درس دیا کرتے تھے جن میں ہر سلسلہ اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ انہی سلسلوں میں سے ایک ہفتہ وار درس "تفسیر قرآن" کے نام سے منعقد کیا جاتا تھا جس میں عام لوگ خصوصاً نوجوان ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ زیر نظر سطور استاد شہید کے اسی سلسلہ درس کی کتابی صورت ہیں۔

بلاشبہ اگر استاد مطہری کسی علمی مجلس میں قرآن کی یہ تفسیر بیان کرتے تو اپنے تبحر علمی، مخصوص باریک بینی اور قرآن سے اپنے بے پناہ عشق کی بنا پر اس تفسیر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے۔ لیکن مجلس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ استاد کا اصل مقصد حاضرین کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق قرآن سے روشناس کرانا تھا۔

ان دروس کو آپ کے شاگردوں نے آپ کی حیات ہی میں کیسٹوں سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے ان کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور خود استاد مطہری کی بھی یہ شدید خواہش تھی کہ ان دروس کو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ لیکن منافقین کے ہاتھوں آپ کی شہادت کے نتیجے میں یہ کام ادھورا رہ گیا لیکن جو کچھ بھی مواد میسر تھا وہ کتابی صورت میں استفادۂ عوام کے لیے منتشر کر دیا گیا۔

دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان ملتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو قرآن سے روشناس کرانے کے جذبہ کے تحت کتاب کا اردو ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ گو کہ قارئین کو تفسیر کے حوالے سے تشنگی کا احساس ہو گا لیکن امید ہے ہماری یہ کاوش نوجوانوں کے لیے ابتدائی طور پر قرآنی مطالب سے آشنائی میں مددگار ثابت ہو گی۔

ناشر

پیغمبرِ اسلام

حضرت محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

- جس نے قرآن کے مطابق کہا
  اس نے سچ بولا۔
- جس نے قرآن کے مطابق فیصلہ دیا
  اس نے انصاف کیا۔
- جس نے قرآن پر عمل کیا
  اسے ثواب ملا۔
- جس نے قرآن پر چلنے کی دعوت دی
  اس نے صحیح رہنمائی کی۔
- یہ قول فیصل ہے
  کوئی ہنسی مذاق نہیں۔
- جو ظالم اسے چھوڑ دے گا
  اللہ اسے پاش پاش کر دے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عربی زبان سیکھنے کی اہمیت وضرورت

الحمد للہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین والصلوٰۃ والسلام علی عبداللہ ورسولہ ونبیہ وصفیہ سیدنا ومولینا ابی القاسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ الطیبین الطاہرین المعصومین نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین

چند گزارشات بہت اختصار کے ساتھ میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ آج رات آپ سے خطاب کرتے ہوئے حقیقتاً مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہو رہی ہے۔

محترم سامعین!

گزشتہ چھ سات سال کے دوران اگر آپ نے میرے جلسوں میں شرکت

کی ہوگی تو آپ اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ میں اپنی تقاریر میں خواہ وہ یہاں ہوئی ہوں یا حسینیہ ارشاد میں یا کسی اور جگہ، عربی زبان کی کلاسیں قائم کرنے پر برابر زور دیتا رہا ہوں۔ مذہبی اداروں کی اولین ذمہ داری لوگوں اور خصوصاً بچوں کو عربی زبان کی تعلیم دینا ہے۔ مساجد، مراکز حسینی، تنظیموں اور تفسیر قرآن کی مجالس کے منتظمین سب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ میں اپنے اس مشورے کے حق میں بہت سے دلائل رکھتا ہوں، ان میں سے بعض دلائل کا میں بڑی سادہ زبان میں ذکر کروں گا تاکہ لوگوں میں عربی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہو۔

سب سے پہلی دلیل تو یہ ہے کہ عربی زبان قرآن مجید کی زبان ہے اور ہماری دینی زبان ہے۔ ہم ایرانیوں کے لیے فارسی زبان قومی زبان کا درجہ رکھتی ہے اور عربی زبان ہماری مذہبی زبان ہے، ہمارا مسلمان ہونا، اسلام سے ہمارے گہرے تعلق کا ہونا اور ہماری مذہبی کتاب قرآن کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت عربی زبان سیکھنے کے لیے ایک بڑی اہم دلیل ہے۔

قرآن کو دوسری مذہبی کتابوں پر اپنی ایک اور خصوصیت کی بنا پر امتیاز حاصل ہے، قرآن کے الفاظ اس کے اعجاز کا ایک حصہ ہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب اپنے نظم کلام اور بیان کے دروبست پر انحصار نہیں کرتی، وہ صرف اپنے مضمون و مدعا پر انحصار کرتی ہے۔ مثلاً توریت ہی کے معاملہ کو لیجیے۔ اصل توریت موسیٰؑ پر نازل ہوئی اور انجیل عیسیٰؑ پر۔ خواہ کوئی آسمانی کتاب ہو اور کسی بھی پیغمبر پر نازل ہوئی ہو، اس کا ہدف اپنے مضمون و مدعا تک محدود رہا ہے۔ اس میں فقط لفظ کی خوبصورتی اور لفظی خصوصیت کو اہمیت نہیں دی گئی۔ اصل اہمیت مضمون کو دی گئی ہے۔ اس کا اظہار کسی لفظ اور کسی شکل میں بھی کیا گیا ہو۔ مضمون وہی ہونا چاہیے۔

لیکن قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ چونکہ انسان پر نازل ہونے والی یہ آخری آسمانی کتاب تھی۔ حکمتِ الٰہی نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ اس کے مضامین جو بہت ہی بلند اور حکمتوں سے مالا مال ہیں، اپنے ان ہی لفظوں کے ساتھ پیغمبرؐ پر نازل ہوں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صرف مضامین ہی نازل نہیں ہوئے بلکہ ان مضامین کے لیے الفاظ بھی وضع کرکے نازل کیے گئے۔

ان دو جلسوں سے قبل تفسیرِ قرآن کے جلسے میں اس نکتہ کو میں کلمہ "اقرء" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے پیش کرچکا ہوں۔ اس جلسے میں شرکت کرنے والے دوستوں سے میں نے کہا تھا کہ دیکھیے قرآن کی پہلی آیت جسے "اِقْرَءْ" کہا جاتا ہے۔ اس کے نکات کا ایک اہم نکتہ یہ ہے:

"اِقْرَءْ" یعنی پڑھ۔

ایسے موقع پر کہا جاتا ہے جبکہ کوئی متن پہلے سے تیار موجود ہو۔ جو کچھ پہلے سے تیار کیا جاچکا ہے ــــــ اسے پڑھو ــــ

یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ قرآن الفاظ کی اسی صورت میں پہلے سے تیار کیا گیا تھا۔ پیغمبر پر نازل ہونے سے قبل عالمِ وحی میں آیاتِ قرآنی اسی شکل میں تیار کی جاتی تھیں۔ بعد میں پیغمبر اکرمؐ کے لیے ان کی تلاوت و قراءت کی جاتی تھی۔

اس وقت "اِقْرَءْ" کا یہ لفظ ان ہی خصوصیات کے ساتھ اور ایک خاص زیبائی کے ساتھ ادا کیا گیا تھا۔ اگر کوئی شخص عربی زبان سے اچھی طرح آشنا ہو اور وہ اسلام سے پہلے کے، اسلام کے بعد کے اور دورِ اسلام کے ادبی شاہکاروں کا قرآن سے موازنہ کرے تو وہ دونوں کے درمیان ایک واضح فرق کو محسوس کرے گا۔ (یہ ایک فطری بات ہے کہ جب کوئی شاہکار وجود میں آجاتا ہے تو بعد میں لوگ اس کی نقل کرتے ہیں)

دور اسلام کے علمی و ادبی شاہکاروں خصوصاً جن کا تعلق ائمہ سے رہا ہے جیسے نہج البلاغہ، جو امیرالمومنینؑ کے کلمات پر مشتمل ہے یا صحیفہ سجادیہ جو امام زین العابدینؑ کے کلام کا مجموعہ ہے، انھیں جب آپ قرآن کے پہلو میں رکھ کر دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن ایک مخصوص اسلوب کا حامل ہے۔ ایک ایسا اسلوب جو اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ نہج البلاغہ کے تمام خطبات سے امیرالمومنینؑ کی فصاحت و بلاغت کا اظہار ہوتا ہے لیکن عین ان خطبات کے وسط میں جب امیرالمومنینؑ کسی آیت قرآنی سے استدلال کرتے ہیں تو اس کی درخشانی کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اس کی خاص چمک دمک سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا ہی کلام ہے۔

بعد میں بہت سے دوستوں نے بھی اور دشمنوں نے بھی قرآن کے اسلوب کی تقلید کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ ہماری آسمانی کتاب ہی کی خصوصیت ہے کہ خود لفظ اور اس کی لفظی خصوصیت بھی اس کے اعجاز کا حصہ ہے۔ یعنی جو کچھ نازل ہوا وہ ایک اعجاز کی صورت میں خدا کی طرف سے نازل ہوا۔

اسی دلیل کی بنا پر کہ قرآن سے ہمارا تعلق ہے اور اسلام سے ہمارا تعلق ہے۔ ہم عربی زبان سے، ایک ایسی زبان سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے جس میں اسلام کا اعجاز نازل ہوا ہے۔ میرے خیال میں انسان جب تک عربی زبان سے اچھی طرح آشنا نہ ہو اسلام کے مطالب اور مفاہیم کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔

اب ہم فارسی زبان کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ کیا فارسی صرف سعدی کی زبان ہے ——؟ یا فقط حافظ کی زبان ہے ——؟ کیا یہ مولوی یا نظامی ہی کی زبان ہے ——؟ کیا فردوسی، سنائی یا عطار ہی اسے اپنی

زبان کہہ سکتے ہیں ——— ؟ ان سوالات کا جواب آپ یقیناً نفی میں دیں گے اور یہ کہیں گے کہ سینکڑوں شاعر اور ادیب اور ان ہی کی محنتوں سے یہ زبان تیار ہوئی۔

اگر سعدی نہ ہوتے تو پھر بھی زبانِ فارسی موجود ہوتی۔ فردوسی اور حافظ نہ ہوتے تب بھی زبانِ فارسی زندہ اور موجود ہوتی۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک نے تنہا اس زبان کو پروان نہیں چڑھایا ہے، مثنوی مولوی بھی اگر موجود نہ ہوتی تو بھی فارسی زبان موجود ہوتی۔ البتہ اس زبان کے بنانے میں ان لوگوں کا حصہ ہے۔

تنہا ایک زبان ایسی ہے کہ اگر اس میں یہ کتاب (قرآن) نہ ہوتی تو شاید آج دنیا میں اس کا کوئی نام نہ لیتا۔ اگر اس کا وجود باقی بھی رہتا تو محض ایک مقامی زبان کی حیثیت سے۔ دنیا کی زبانوں میں اس کا سوواں نمبر ہوتا اور وہ کوئی قابلِ ذکر زبان نہ ہوتی۔ اسے عرب کے ایک وحشی قبیلے کی زبان کی حیثیت سے یاد کیا جاتا۔ یہ قرآن ہے جس نے عربی زبان کو ایک زبان کا مقام عطا کیا۔

عربی زبان عرب قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ عرب قوم کی زندگی اور وجود عربی زبان کی وجہ سے باقی ہے۔ عربی زبان اپنے وجود و بقا کے لیے عربوں کی محتاج نہیں ہے۔

مصری، شامی، جزائری، اردنی، عراقی، مراکشی، تونسیہ اور دوسری اکثر عرب اقوام کا تعلق حجاز اور یمن سے نہیں رہا ہے۔ یہ لوگ عرب ہیں تو قرآنی زبان کی وجہ سے عرب ہیں۔ ان اقوام نے جب قرآن سے رابطہ پیدا کیا تو اپنے لیے قرآن ہی کی زبان کو اختیار کر لیا اور اس طرح وہ عرب کہلانے لگے۔ یہ اقوام عربی النسل نہیں ہیں۔ یہ عربی زبان سے وابستہ و متعلق ہیں، عربی زبان ان سے متعلق اور وابستہ نہیں ہے۔

ہمارا یہ خیال درست نہیں ہے کہ عربی زبان مصریوں اور الجزائریوں سے متعلق ہے۔ یقیناً وہ ان سے متعلق نہیں ہے۔ زبان عربی جس قدر ہم سے متعلق ہے اسی قدر ان سے بھی متعلق ہے۔ وہ لوگ اس دلیل کی بنیاد پر عربی زبان کو خود سے متعلق کرتے ہیں کہ وہ کسی دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن جب انھوں نے اسلام کو قبول کیا تو وہ اس زبان میں لکھنے پڑھنے لگے۔ بعد میں اپنی مادری زبان کو انھوں نے ترک کر دیا، چونکہ عربی زبان ان کی مذہبی زبان بن گئی تھی اس لیے وہ اس زبان کو اپنے سے متعلق زبان کہنے لگے۔

ہم سب مسلمان ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر عربی زبان حجازی زبان نہیں ہے، یمنی زبان بھی نہیں ہے۔ یہ قرآن کی زبان ہے۔ کیا کوئی قوم یہ کہہ سکتی ہے کہ قرآن صرف اس سے متعلق ہے ــــــــ؟ کیا حجازی، یمنی اور مصری یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن صرف ان ہی سے متعلق ہے ــــــــ؟ نہیں ان میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح جو زبان قرآن سے متعلق ہے کوئی قوم اس کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ یہ صرف اس کی ہے۔ عربی زبان بین الملّی اسلامی زبان ہے۔

اسی لیے ہم اپنی مذہبی ضرورت کی بنا پر عربی زبان کا سیکھنا لازمی سمجھتے ہیں۔ خصوصاً اس بنا پر کہ استعماری تعلیم و تہذیب نے ایک عجیب صورت حال پیدا کر دی ہے اور نہیں معلوم اس سے ان کا کیا مقصد ہے؟ ہمارے مدارس میں عربی کی تعلیم جس طریقے سے دی جاتی ہے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ عربی کی تعلیم نہ دی جائے۔ عربی زبان کی کتاب اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ کوئی شخص عربی نہ سیکھ سکے۔ البتہ عربی زبان سے ایک طرح کی وحشت پیدا کر کے بھاگ

کھڑا ہو۔

بچوں کے لیے عربی زبان سیکھنا پہاڑ کھودنے کے مترادف ہو چکا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ اس طرح کی مجالس و محافل اور ایسی کلاسوں کے ذریعہ، بہت ہی قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کر کے، عربی زبان کو ایسے آسان طریقے سے سکھایا جائے گا کہ وہ وحشت و پریشانی دور ہو جائے گی جو مدارس کی جماعتوں میں عربی سیکھنے والے طلبہ کو عام طور پر لاحق ہوتی ہے۔

دوسرے مسئلے کا تعلق زبانِ عربی کو یاد کرنے کی ضرورت اور اس کے لازمی ہونے سے ہے۔ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اگر آپ سچ پوچھیں تو ہم نہ عربی تہذیب رکھتے ہیں اور نہ فارسی تہذیب۔ ہم ایک اسلامی تہذیب کے حامل ہیں جس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ کا تعلق عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور اُردو سے ہے۔ اگر کوئی تہذیب و تمدن کا ماہر ہمارے معاشرہ میں قدم رکھے اور اسلامی تہذیب کا مطالعہ و مشاہدہ کرے تو وہ بہت جلد یہ معلوم کرے گا کہ یہ تہذیب مختلف زبانوں میں جلوہ گر ہے اس کے جلووں میں سے ایک جلوہ فارسی زبان ہے۔ آپ اسے اسلامی تہذیب کا فارسی روپ کہہ سکتے ہیں۔ آج اس روپ نے ایک لطیف و عمیق صورت اختیار کر لی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی شخص عربی زبان سے واقفیت حاصل کیے بغیر فارسی تہذیب کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے؟

میں مثنوی و سنائی کی بات نہیں کروں گا، میں ناصر خسرو کی بھی بات نہیں کرتا البتہ سعدی ایک ایسا نثر پرداز و شاعر ہے جسے سہل و ممتنع کہنے میں امتیاز حاصل ہے ان سب میں وہ رواں تر اور سلیس تر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص زبان عربی سے آشنائی پیدا کیے بغیر کلیات سعدی کو اچھی طرح سمجھ سکے؟

اب ہم سعدی کے کلام کے اس پہلو پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس نے ایک شعر عربی کا کہا ہے تو دوسرا فارسی کا، ایک مصرعہ عربی میں ہے تو دوسرا فارسی میں۔

سعدی اگر عربی زبان اور عربی تہذیب سے آشنا نہ ہوتا تو شاید سعدی نہ بن سکتا۔ سعدی کی زبان سے آشنائی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ شخص فی الاصل عربی تہذیب میں پروان چڑھا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایسی اصطلاحات استعمال کرتا ہے جو ایران کے ماحول سے ہم آہنگ نظر نہیں آتیں البتہ عربی ماحول سے مطابقت رکھتی ہیں۔

چشم بدت ورای بدیع شمائل
ماہ من و شمع جمع میر قبائل

میر قبائل فارسی کی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ عربی کی اصطلاح ہے بسعدی کے کلام میں اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔

اب اگر ہم اس اعتبار سے مثنوی مولوی روم کا جائزہ لیں تو اس میں بھی عربی کی اصطلاحات بہت ملیں گی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک گروہ اس تہذیب کا دشمن ہے اور وہ موجودہ فارسی تہذیب کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اسلامی تہذیب کے دشمن ہیں اور بڑی خیر خواہی ظاہر کرتے ہوئے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے سارے انحطاط اور پسماندگی کا سبب یہی رسم الخط ہے۔ ہم اسے تبدیل کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیتے ہیں۔ ترکوں نے اپنا رسم الخط تبدیل کیا اور کیسی ترقی کی!

پھر وہ اپنی بات کو اور آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔ ہم کیوں نہ فارسی زبان سے عربی الفاظ کو نکال باہر کریں۔

آپ جانتے ہیں کہ اگر ہم نے ان "خیر خواہانِ ملت" کی تجویز قبول کر لی تو اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دو نسلوں کے گزرنے کے بعد

آپ زبان فارسی کے ہزار سالہ اثاثے سے (میں عربی زبان کی بات نہیں کرتا) کٹ کر رہ جائیں گے اور بات اس انتہا تک پہنچ جائے گی کہ اگر آپ گلستان سعدی کسی اسکول یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طالب علم کے سامنے رکھیں گے تو وہ اسے نہیں سمجھ سکے گا۔

اس گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ کہتے ہیں:

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم مغربی تہذیب میں جذب ہو جائیں ہمارے لیے یہ کام بہت آسان ہے، ہم نے انگریزی زبان سیکھی ہے — فرانسیسی زبان سیکھی ہے — اور — کچھ دوسری زبانیں بھی سیکھی ہیں، ہم ان اجنبی زبانوں سے پوری طرح آشنا ہو گئے ہیں، ان زبانوں کے رسم الخط سے بھی ہم آشنا ہیں، اس لیے ان کے مضامین و مطالب کو بھی ہم بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی تہذیب سے بھی ہم نے کم و بیش آشنائی پیدا کر لی ہے یا پیدا کرنے جا رہے ہیں اس طرح ہمارے ماضی سے ہمارا رابطہ منقطع ہوتا چلا جائے گا۔"

بہت خوب!

آپ کا یہ مشورہ بڑا اچھا ہے آپ اس تجویز کو رو بہ عمل لا کر یہاں کون سی نسل پروان چڑھانا چاہتے ہیں — ؟

کیا آپ ایک ایسی نسل پروان چڑھانا چاہتے ہیں جس کی مثال اس بچے کی سی ہو جو راستے میں پڑا ہوا مل جائے۔ اور اسے کسی پرورش گاہ میں رکھ کر چھوٹے سے بڑا کیا جائے اور پھر لوگ اس سے پوچھیں:

"تیرا باپ کون ہے؟"

تو وہ جواب دے:

"میں نہیں جانتا!"

"تیری ماں کون ہے؟"

جواب ملے گا:

"مجھے نہیں معلوم۔"

کیونکہ اس کا رابطہ تو پہلے ہی دن اپنے ماں باپ سے کٹ گیا تھا۔ اس کا تعلق تو اس خاندان سے رہا ہے جس میں وہ پل کر بڑا ہوا۔ اس سے آپ پوچھیں گے:

"تیرا باپ کون ہے؟"

تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ جواب دے گا:

"میں جب بڑا ہوا تو میں نے ان جناب کو دیکھا اور پہچانا تھا۔"

"اچھا تیری ماں کون ہے؟"

جواب ملے گا:

"ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں ان ہی خاتون کو دیکھتا رہا ہوں۔"

یہ لوگ ہماری نئی نسل کو ایسے ہی لاوارث بچے کی طرح پروان چڑھانا چاہتے ہیں جو نہ اپنے باپ کو جانتا ہے اور نہ ماں کو۔ کسی بھی قوم کے ماں باپ اس کی ماضی کی تہذیب اور اس کی پچھلی تاریخ ہی ہوتے ہیں۔ اس ماضی سے ہمارے تعلق کو کاٹنے ہی کے لیے یہ لوگ اس طرح کی تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تجاویز میں یہ بھی شامل ہے کہ عربی الفاظ کو نکال باہر کیا جائے۔

سعدی نے اسی جدید فارسی زبان سے، یعنی عربی اور فارسی دونوں لغات سے فائدہ اٹھاکر توانائی اور قوت حاصل کی ہے۔ اس کے کلام میں توانائی اور زور اسی لیے پیدا ہوا کہ وہ فارسی کلمات بھی استعمال کرتا ہے اور عربی کلمات بھی۔ وہ فارسی ترکیبات سے بھی کام لیتا ہے اور عربی ترکیبات سے بھی۔ یہ دونوں اس کے ہاتھوں میں موم کی طرح نظر آتے ہیں اور انھیں جس صورت میں چاہتا ہے ڈھالتا چلا جاتا ہے۔

فردوسی کو لیجیے اس کے کلام میں عربی بہت کم ہے۔ صرف فردوسی فارسی زبان کو فارسی نہیں بناتا۔ اور کوئی بھی تنہا فارسی تہذیب کو فارسی تہذیب نہیں بنا سکتا۔

آپ حافظ کو بھی نہیں سمجھیں گے کہ اس کا پہلا شعر ہی عربی سے شروع ہوتا ہے:

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

کہ عشق آساں نمود اول ولی افتاد مشکلہا

پھر اس کا آخری مصرع بھی عربی میں ہے:

حضوری گر ہمی خواہی از او غافل مشو حافظ

متی ما تلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

اس کا پہلا مصرع بھی عربی میں ہے اور اس کا آخری مصرع بھی عربی میں ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم حافظ کے کلام کو چومیں اور پھر الگ رکھ دیں سعدی کے کلام کو بوسہ دیں اور اسے بھی اٹھا کر رکھ دیں۔ مثنوی کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں۔ ہمارے پاس جس کسی کا اور جو بھی کلام ہے اسے اٹھا کر ایک طرف رکھتے چلے جائیں البتہ شیکسپیر کے کلام کا دل و جان سے مطالعہ کریں۔

خوب! پھر تو ہمارا کام تمام ہو چکا۔ اس وقت تو ہم اپنے ایرانی ہونے کو

بھی بھول جائیں گے کجا کہ ہمیں اپنا مسلمان ہونا یاد رہ سکے۔

اس بنا پر اگر ہم فی الواقع اپنی تہذیب سے، اپنی فارسی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ کسی بھی قوم اور ملّت کی شخصیت کی بقا اور اس کا استقلال اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی جو تعمیر جدید بھی کرنا چاہے ضرور کرے لیکن اس تعمیر جدید کی بنیاد اس کی ماضی کی تہذیب ہی ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ قوم فنا ہو جائے گی، کمزور ہو جائے گی اور اس کا حال ایک لاوارث بچے کا سا ہوگا۔

اس نقطۂ نظر سے بھی ہمیں لازماً عربی زبان سیکھنی چاہیے۔ اگر ہم عربی زبان نہیں سیکھیں گے تو ہم نہ مسلمان باقی رہیں گے اور نہ ایرانی۔ آقائے محیط طباطبائی (اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے، ایک دانش مند اور بڑی معلومات رکھنے والی شخصیت ہیں) نے اپنے مقالات میں بعض بڑے اچھے نکات پیدا کیے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے اطلاعات میں شائع ہونے والے اپنے دو مقالات میں اغیار سے تربیت اور ہدایت حاصل کرنے والے اس گروہ پر تنقید کی تھی اور ان کے مقالات کا عنوان تھا:

"عربی زبان کے الفاظ کو فارسی زبان سے ہم کیوں نہ نکال دیں؟"

ضمناً انھوں نے یہ پر لطف بات لکھی کہ:

"سعدی کے مضامین ہمیں بچوں کو نہیں پڑھانے چاہییں اور اس بوستان سعدی کو بھی ہمیں ان کے نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ شخص بچوں کو بری باتیں سکھاتا ہے اور ان کے اخلاق کو بگاڑتا ہے ــــ!

"کیوں ــــ؟" اس لیے کہ وہ کہتا ہے:

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راست فتنہ انگیز است۔"

"مصلحت آمیز جھوٹ فتنہ انگیز سچ سے بہتر ہے۔"

وہ ان بچوں کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے بے چارے سعدی نے یہ نصیحت اپنی ایک حکایت میں کی ہے۔ اس نے خود اپنی اس حکایت میں یہ تشریح کر دی ہے کہ مصلحت آمیز جھوٹ نہ کہ منفعت آمیز جھوٹ۔ منفعت آمیز جھوٹ وہ ہوتا ہے جو آدمی اپنے ذاتی فائدے کے لیے بولتا ہے اور مصلحت آمیز جھوٹ اُسے کہتے ہیں جو آدمی کسی اجتماعی فائدے اور بھلائی کی خاطر بولتا ہے۔

(سعدی نے اپنی اس حکایت میں لکھا ہے:

"ایک شخص کو بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ وہ شخص بے گناہ تھا۔ اس شخص نے جب یہ دیکھا کہ اسے قتل کیا جا رہا ہے اور زندگی کی کوئی امید باقی نہیں تو اس نے بادشاہ کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

حاکم نے پوچھا: "یہ کیا کہتا ہے؟"

ایک خیر خواہ وزیر جو وہاں موجود تھا اس نے عرض کی، یہ شخص کہہ رہا ہے: "الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس۔"

"وہ لوگ غصے کو پینے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔"

وہاں ایک فسادی شخص بھی موجود تھا۔ اس نے اسی راست گوئی کے عین مطابق جس کی یہ لوگ تبلیغ کرتے ہیں۔ کہا:

"بادشاہوں کے سامنے ہمیں جھوٹ نہیں بولنا چاہیے
ہم وزرا کو ہمیشہ سچ کہنا چاہیے"
بادشاہ بھی بڑا عاقل اور سمجھ دار تھا۔ اس نے فرمایا:
"اس دروغ گو نے جو مصلحت آمیز جھوٹ بولا،
تیرے اس فساد پیدا کرنے والے سچ سے اچھا تھا"
"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستِ فتنہ انگیز"

حقیقت یہ ہے کہ آج کسی نہ کسی بے گناہ کو لوگ قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اب اگر کوئی بے گناہ شخص گلی سے نکل کر فرار ہو جائے اور اس کا تعاقب کرنے والے مجھ سے اس کے بارے میں سوال کریں تو کیا مجھے یہ بتا دینا چاہیے کہ وہ کس طرف گیا ہے تاکہ وہ اس بے گناہ کو جا کر قتل کر دیں یا مجھے ایک بے گناہ کی جان بچانے کے لیے اور انسانیت کی خاطر، کوئی مصلحت آمیز جھوٹ کہہ دینا چاہیے۔ انسانیت کا تو تقاضہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ہم ایک مصلحت آمیز جھوٹ کہہ کر بے گناہ کی جان بچا لیں۔

آقائے محیط نے لکھا تھا:

"جب انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے ——
تو انھوں نے جو احکام جاری کیے ان میں سے ایک
یہ تھا کہ مدارس میں گلستانِ سعدی نہ پڑھائی
جائے۔ ان کا عذر بھی یہی تھا کہ سعدی بُری باتیں
سکھاتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:
"دروغ مصلحت آمیز بہ از راست فتنہ انگیز است"
جب اس معاملہ کی تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ انھوں نے

خوب سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ انھوں نے
دیکھا کہ سعدیؔ نے گلستان کے آغاز ہی میں
یہ کہا ہے :

اے کریمی کہ از خزانۂ غیب گبر و ترسا وظیفہ خورداری
دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمنان نظر داری

"اے کریم! تیرے خزانۂ غیب سے آتش پرست
اور مسیحی وظیفہ پاتے ہیں تو کہ دشمنوں کا بھی خیال رکھتا
ہے دوستوں کو کس طرح محروم کرسکتا ہے۔"

انگریزوں نے جائزہ لیا اور دیکھا کہ جب ہندوستانی بچے باشعور ہو جاتے ہیں تو انھیں فارسی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اب اگر وہ مدرسہ میں گلستان پڑھ کر یہ سیکھتا ہے کہ "ترسا" مسیحی کو بولتے ہیں یعنی یہ کہ یہ انگریز استعماری اور دشمن خدا ہیں تو شروع ہی سے دشمنی کا بیج ان کے خمیر میں پڑ جائے گا اور وہ لازماً یہ کہے گا :

"جناب! یہ خدا کے دشمن کیوں یہاں آکر ہم پر حکومت
کرتے ہیں ـــ؟

انگریز نے گلستان کا درس بند کرنے کا حکم دینے کی یہ اصل وجہ ظاہر نہ کی کہ سعدیؔ نے گبر و ترسا کے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ دشمنان خدا ہیں بلکہ اس نے یہ عذر پیش کیا کہ سعدیؔ نے :

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راست فتنہ انگیز"

کی نصیحت کی ہے ـــــ بہت خوب! جب دشمن اس قدر چالاک ہے تو ہم کیوں ہشیار نہ رہیں ـــ؟

اب میں یہاں اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرے دوست اور رفقا سب سے پہلے تو ایک مذہبی فریضے کی حیثیت سے اور اس کے بعد ایک ملی ذمہ داری کے طور پر اسلامی فارسی تہذیب کی بقا کے لیے کوشش کریں گے اور عربی زبان کو اچھی طرح سیکھیں گے تاکہ وہ عربی کتابوں سے استفادہ کرسکیں، قرآن سمجھ کر پڑھ سکیں ——— نہج البلاغہ پڑھ سکیں ——— ابو حمزہ کی دعا پڑھ کر لطف حاصل کرسکیں ——— نماز سمجھ کر پڑھ سکیں ——— اور ——— لذت حاصل کرسکیں ——— اور ——— حضور قلب پیدا کرسکیں ——— اپنی دعاؤں اور قنوت کو سمجھ سکیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ سب میری اس بات سے اتفاق فرمائیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خدا کے نام کے ساتھ ہر کام کی ابتدا

آیہ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم مجموعی طور پر جار اور مجرور ہے اور ایک مکمل جملہ نہیں ہے۔ اس جار اور مجرور کا متعلق محذوف ہے لیکن اس کا محذوف کیا ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ مثلاً:

"استعین"

(ہم مدد طلب کرتے ہیں)

"ابتداء"

(میں شروع کرتا ہوں)

اور "اسم"

(میں نام ونشانی رکھتا ہوں)

قوی گمان یہی ہے کہ لفظ "اسم" ہی محذوف ہے۔

نام رکھنے میں کئی مقاصد اور محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ کبھی ایک شخص کسی ادارے کو کسی کے نام سے منسوب کرتا ہے تاکہ اس نام کی وجہ سے مالی فائدے حاصل کر سکے یا نومولود کا نام ایسے شخص کے نام پر رکھا جاتا ہے جو ماضی میں مقبول عام رہ چکا ہو اور خواہش ہوتی ہے کہ یہ نام رکھنے سے ماضی کا وہ شخص نئی زندگی پائے اور اس نام کی بقا سے زندہ رہے۔

لیکن انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کام خدا کے نام سے شروع کرے اس کا کیا محرک ہو سکتا ہے؟

وہ یہ کہ انسان کے کام تقدس اور عبادت کا رنگ اختیار کریں اور خدا کے نام سے بابرکت ہوں۔

انسان کو خدا تعالیٰ کا ایک فطری احساس ہے اور وہ اسے ایک مقدس وجود اور منبع خیر سمجھتا ہے۔ جب انسان نے اپنے کام پر خدا کے نام کا اطلاق کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے تقدس، شرافت اور لطف کے سایہ میں یہ عمل بھی مقدس ہو جائے۔

کسی کے نام پر کام شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے پاک اور تمام نقائص سے مبرا اور سرچشمہ کمالات وجود سمجھا گیا ہے اور اپنے عمل کو اس سے منسوب کرکے عمل کو بابرکت بنانا مطلوب ہے

لہذا کاموں کی ابتدا خدا کے علاوہ حتیٰ کہ پیغمبر کے نام سے بھی نہیں کی جا سکتی یہ ہیں اللہ کے نام کی تسبیح کے معنیٰ۔ وہ نام جس کا حکم سورۂ اعلیٰ کے شروع میں دیا گیا ہے۔

"یسبح للہ" یا "سبح للہ" یا "سبحان اللہ"

خدا کی تسبیح ہیں یا خدا کے لیے تسبیح ہیں اور قرآن میں متعدد بار آئی ہیں۔

لیکن اللہ کے نام کی تسبیح صرف سورۂ اعلیٰ کے ابتدا میں ہے ۔
خدا فرماتا ہے :

" سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى "
" (اے رسولؐ) اپنے عالیشان پروردگار کے نام
کی تسبیح کرو۔"

خدا کی تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تقدیس و تکریم کا مقام ہے وہاں خدا کے نام کے ساتھ کسی دوسری مخلوق کا نام نہ آئے ۔ اور جہاں اللہ کا نام لینا مقصود ہے وہاں کسی دوسرے کا نام نہ لیا جائے ۔ یعنی نہ خدا کے نام کے ساتھ کسی کا نام آئے اور نہ خدا کے نام کی جگہ کسی دوسرے کا نام لیا جائے ۔ یہ دونوں کام شرک ہیں ۔

کچھ حضرات ایسے ہیں جو شرک کے خلاف جدوجہد کا دم بھرتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک رسم ایسی رائج ہو گئی ہے جو خود شرک کا مظہر ہے ۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے کام کو خدا سے منسوب کریں یا خدا کے نام سے شروع کریں وہ کہتے ہیں :

" بنام انسانیت "

اگر پیغمبر کا نام خدا کے نام کے ساتھ رکھا جائے تو یہ شرک ہے ۔ پس اگر بنام انسانیت کام کا آغاز کیا جائے تو یہ عمل خدا کے جانشین بنانے کے مترادف ہوگا اور قرآن کا یہ حکم ہے کہ انسان خدا کے نام کی تسبیح کریں اور اپنے کاموں کو اسی کے نام سے شروع کریں کسی اور کے نام سے نہیں ۔ اس طرح ان کے اعمال کو تقدس حاصل ہوگا اور اس کے نام سے برکت ہوگی ۔

اللہ

اللہ خدا کا ایک نام ہے۔ افراد یا اشیاء کے نام رکھنے کا کبھی مقصد ان کی علامت مقرر کرنا ہوتا ہے اور کبھی اس کی تعریف کرنا۔

پہلی قسم میں اگرچہ ناموں کے اپنے معانی ہوتے ہیں لیکن وہ اپنا اصل مقصد حاصل نہ کر سکے بلکہ صرف اس نام کی تشخیص اور تجدید تعارف کے لیے رکھے گئے لہٰذا وہ محض ایک علامت ہوتے ہیں۔

بعض اوقات ایسے نام کے معانی صاحب نام کے اوصاف کے ترجمان نہیں ہوتے بلکہ ممکن ہے اس کے برعکس ہوں جیسے کسی جاہل آدمی کا نام "علیم الدین" ہو۔

دوسری قسم میں نام صاحب نام کی شان و مرتبت بیان کرتا ہے اور اس کی صفت کا ترجمان ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ کا ایسا کوئی نام نہیں ہے جو محض علامتی ہو، اس کے تمام اسماء ذات مقدس کے حقائق کی کسی نہ کسی حقیقت کو روشن کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں خدا کے تقریباً سو نام مذکور ہوئے ہیں جو در حقیقت سو صفات ہیں جن میں سے بعض کا سورۂ فاتحہ میں ذکر ہوا ہے۔ مثلاً:

"اللّٰہ، رحمٰن، رحیم، مالک یوم الدین"

لیکن ان میں سے کسی نام میں بھی "اللّٰہ" نام جیسی جامعیت نہیں ہے کیونکہ دوسرے تمام نام کسی ایک کمال اور وصف کو بیان کرتے ہیں لیکن یہ نام تمام کمالی اوصاف کی مجموعہ ذات کا ترجمان ہے۔

لفظ " اللہ " دراصل " الالـہ " تھا اور ہمزہ کثرت استعمال کی وجہ سے حذف ہوگیا ہے

لفظ " اللہ " کے ماخذ پر مختلف نظریات موجود ہیں۔ بعض اسے " الـہ " سے مشتق بتاتے ہیں اور بعض " ولہ " سے۔ " الہ " کا فعال مفعول کے معنی میں ہے جیسے کتاب مکتوب کے معنی ہیں۔

اگر مشتق کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یعنی اللہ کے بعد عبد۔ یعنی قابل پرستش ذات وہ ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ جو وجود کسی دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہے یا اس میں نقص ہے وہ قابل پرستش نہیں ہے۔ پس جوں ہی یہ کہا جاتا ہے کہ " الالـہ " یعنی وہ ذات ایسی ہے کہ اس کی پرستش ہونی چاہیے تو خود بخود اس میں یہ معانی پوشیدہ ہیں کہ:

ایسی ذات جو کمالیہ صفات کا مجموعہ ہو اور ہر قسم کے
نقص سے پاک ہو۔

اگر اللہ " ولـہ " سے مشتق ہو تو " ولـہ " کا معنی ہے حیرت " والہ " یعنی حیران یا عاشق وشیدا۔ خدا کے لیے اللہ کہا گیا ہے کہ عقول اس کی مقدس ذات کے سامنے حیران ہیں یا اس کی عاشق اور اس کی پناہ میں ہیں۔

سیبویہ کو عربی ادب کے علمائے صرف ونحو کا امام سمجھا جاتا ہے۔ اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ لفظ اللہ کا ماخذ " ولہ " ہے جو عظمت کے مقابلے میں حیرت کے معنی میں یا عشق کے معنی ہیں۔ مولانا روم نے سیبویہ کا یہ نظریہ نقل کیا ہے۔

معنی اللہ گفت آن سیبویہ   یولھون فی الحوائج ہم لدیہ
گفت الھنا فی حوائجنا الیک   والتمسنا ہا وجدنا ہا لدیک

مولوی نے وہ حالت یاد دلائی ہے جب انسان درد میں مبتلا ہو کر بے چارگی

کے عالم میں بے اختیار ایک نقطے کی طرف آتا ہے اور اس کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ وہ نقطہ "اللہ" ہے۔

صد ہزاراں عاقل اندر وقت درد
جملہ نالاں پیش آن دیان فرد
بلکہ جملہ ماہیان در موج ھا
جملہ پرندگان در اوج ھا
بلکہ جملہ موجہا بازی کنان
ذوق و شوقش را عیان اندر عیان

صرف انسان ہی ضرورت کے وقت اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے دریا کی موجوں میں مچھلیاں اور آسمان کی وسعت میں پرندے بھی اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں بلکہ وہ بے جان موجیں بھی خدا کے حضور نالاں و گریاں ہیں۔

قوی گمان یہی ہے کہ "الہ" اور "ولہ" ایک ہی لغت کے دو لہجے ہیں یعنی پہلے "ولہ" اور بعد میں "الہ" کی صورت میں تلفظ ہوا تو پرستش کا مفہوم بھی دینے لگا۔

لہٰذا "اللہ" کا معنی یہ ہوگا:

"وہ ذات جس کی تمام موجودات لاشعوری طور پر والہ و شیدا ہیں اور وہ واحد حقیقت ہے جو پرستش کے قابل ہے۔"

اللہ کا ترجمہ:

یوں کہنا چاہیے کہ اللہ کے مترادف کوئی ایسا لفظ نہیں جو "اللہ" کا

تمام تر مفہوم بیان کر سکے۔

یعنی اگر ہم " اللہ " کی جگہ " خدا " استعمال کریں تو وہ مکمل نہ ہوگا کیونکہ لفظ " خدا " " خود آی " کا مخفف ہے اور ایک ایسی توجیہ ہے جو فلاسفہ کرتے ہیں۔ یعنی "واجب الوجود" جو شاید " اللہ " کی بجائے قرآن میں مذکور لفظ " غنی " کے زیادہ قریب تر ہو۔

اگر لفظ " خداوند " استعمال کریں تو بھی وہ جامع اور مکمل نہ ہوگا۔ کیونکہ خداوند کا مطلب ہے : صاحب ، مالک ۔ اگرچہ " اللہ " خداوند بھی ہے لیکن خداوند کے مترادف نہیں ہے۔ " خداوند " " اللہ " کی صرف ایک شان ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ان دو الفاظ کا بھی لغت میں مترادف ڈھونڈنا مشکل ہے۔ اگرچہ عام طور پر ان الفاظ کا ترجمہ " بخشنے والا ، مہربان ، رحم والا۔ کیا جاتا ہے لیکن ان الفاظ سے اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہوتی۔ کیونکہ " بخشنے والا " لفظ " جواد " کا ترجمہ ہے اور " مہربان " لفظ " رؤف " کا ترجمہ ہے۔ اور یہ دونوں پروردگار کی صفات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے۔

جواد ، (بخشنے والا) یعنی وہ جس کے پاس کوئی چیز ہے اور وہ کسی معاوضے کے بغیر دوسروں کو بخش دیتا ہے۔

لیکن " رحمان " اور " رحیم " دونوں " رحمت " سے مشتق ہیں اور لفظ رحمت میں ایک زائد مفہوم پنہاں ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی مخلوق ضرورت مند اور مستحق ہے لفظ اور زبان کے ذریعے اس کا دست سوال دراز ہے

اور اصطلاحاً قابل رحم ہے اور اس چیز کی مستحق ہے کہ اسے کوئی چیز دی جائے تو ایسے مواقع پر عمل کا نام "رحمت" ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ انسانی رحمت اس وقت ایک مستحق تک پہنچتی ہے جب انسان قابل رحم شخص کی حالت سے متاثر ہو، اس کے دل میں رقت پیدا ہو۔ لیکن خدا تعالیٰ ایسی قیود و شرائط سے پاک ہے۔

پس جب ہم "رحمان" اور "رحیم" کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں دو معانی اجاگر ہوتے ہیں:

ایک مخلوقات کی وسیع اور وافر ضرورتیں، جیسے تمام مخلوقات اپنے اپنے انداز میں خدائے بے نیاز کی درگاہ میں جھولی پھیلائے ہوئے ہیں اور التماس کر رہی ہیں۔

دوسرا یہ کہ خدا نے اپنی بے پایاں رحمت مخلوقات کی طرف کھینچی اور ان کی ضروریات کو پورا کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بعض فارسی مترجمین نے ان کلمات کا جامع مترادف نہ پایا تو آیت: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا ترجمہ "بنام اللہ رحمٰن رحیم" (رحمان رحیم اللہ کے نام سے) ہی کیا۔

رحمان اور رحیم میں کیا فرق ہے؟

پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ عربی زبان میں جو الفاظ "فعلان" کے وزن پر ہیں وہ کثرت پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً عطشان کا مطلب بہت زیادہ پیاس ہے۔

اور جو الفاظ "فعیل" کے وزن پر ہیں جنہیں اصطلاح میں صفت مشبہ بھی کہا جاتا ہے وہ ثبات اور دوام پر دلالت کرتے ہیں۔

لفظ "رحمٰن" جو کہ "فعلان" کے وزن پر ہے کثرت اور وسعت پر دلالت کرتا ہے اور اس امر کا ترجمان ہے کہ خدا کی رحمت سب جگہ پھیلی ہوئی ہے اور سب چیزوں پر محیط ہے۔

اصولی طور پر ہر چیز کا چیز ہونا رحمت حق کے مساوی ہے۔ کیونکہ وجود اور ہستی عین رحمت ہے۔ جیسا کہ سورہ اعراف آیہ ۱۵۶ میں ہے:

"وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ"

"میری رحمت سب چیزوں پر محیط ہے"

اور دعائے کمیل میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَبِرَحْمَتِكَ الَّتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ"

اس قسم کی رحمت حق استثنا نہیں رکھتی ہے اور ایسا نہیں ہے کہ انسانوں کے شامل حال ہو مگر غیر انسانوں کے شامل حال نہ ہو۔ یا انسانوں میں صرف مومن انسانوں پر ہو۔ بلکہ یہ سارا جہان حق کی رحمانیت میں شامل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے یہ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے کہ خدائے عالم کو جو کچھ ملتا ہے اس کا دوہرا معیار نہیں ہے۔ خیر و شر۔ بلکہ اس سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ سب بھلائی اور رحمت ہے اور یہ رحمت جمادات، نباتات، حیوانات اور ہر قسم کے انسانوں کے شامل حال ہے۔ کیونکہ اصولی طور پر ہستی کا افتتاح رحمت حق کے ساتھ ہے۔

لفظ "رحیم" "فعیل" کے وزن پر ہے اور حق کی دائم اور نہ ٹوٹنے والی رحمت پر دلالت کرتا ہے۔ رحمان، پروردگار کی وسعت رحمت پر دال ہے اور تمام موجودات کے شامل حال ہے لیکن آخر کار اس دنیا میں کچھ موجودات تخلیق و ہستی کے بعد ختم اور فنا ہو جاتی ہیں لیکن "رحیم" رحمت

کی وہ قسم ہے جو جاوداں ہے اور صرف ایسے لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے
جو ایمان اور عمل صالح کے ذریعے خود کو حق کی خاص رحمت کے راستے پر ڈالتے ہیں۔
پس پروردگار کی ایک رحمت عام ہے اور ایک رحمت خاص۔ اس نے
رحمت عام سے سب موجودات کو پیدا کیا ہے جن میں انسان بھی شامل ہے۔
تمام مخلوقات میں سے صرف انسان ہی جواب دہ اور اپنا ذمہ دار ہے۔
اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے گا تو اللہ کی خاص رحمت اس کے شامل حال ہوگی
رحمٰن اس بے پایاں رحمت کی طرف اشارہ ہے جو ہر جگہ مومن و کافر، انسان
جماد و نبات و حیوان پر محیط ہے لیکن رحیم اس خاص رحمت کی طرف
اشارہ ہے جو مطیع اور فرماں بردار انسانوں کے لیے مخصوص ہے۔[1]

---

[1] روایات میں رحمان اور رحیم کا فرق یوں بیان کیا گیا ہے۔ امام صادقؑ سے حدیث منقول ہے: "واللہ الٰہ کل شیء، الرحمٰن لجمیع خلقہ، الرحیم بالمؤمنین خاصۃ" (کافی۔ توحید صدوق۔ تفسیر عیاشی) اس حدیث میں لفظ رحمٰن پروردگار کی رحمت کا ترجمان ہے جو تمام موجودات کے لیے مخصوص ہے اور رحیم صرف مومنین کے لیے۔

فاتحہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ الرَّحۡمٰنِ
الرَّحِيۡمِ ۙ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ اِيَّاكَ
نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ اِهۡدِنَا
الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ
اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ
عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ؕ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ"

لُغت میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جو لفظ "حمد" کا ترجمان ہو۔ البتہ دو ایسے الفاظ ملتے ہیں جو "حمد" کے معنی کے قریب تر ہو سکتے ہیں اور جن سے لفظ "حمد" کے ترجمہ کے لیے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ایک لفظ "تعریف" ہے اور دوسرا "شکر" ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک لفظ الگ صورت میں اصلی معنی تک نہیں پہنچاتا۔

اب پہلے لفظ "تعریف" کو لیں۔ تعریف مخصوص انسانی احساسات وجذبات سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی یہ انسان ہے جس کے ادراک واحساس کا عالم یہ ہے کہ جب وہ اپنے سامنے کمال وجلال یا خوبصورتی دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایسا ردِعمل پیدا ہوتا ہے جس سے وہ اپنے مدِمقابل کی تعریف کرتا ہے۔ یہ احساس حیوان میں نہیں ہے۔ حیوان میں نہ کمال وجلال اور عظمت کے ادراک کی قوت ہے اور نہ وہ ان اوصاف کا مداح ہے۔

انسان میں کبھی تعریف کا عمل پستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جسے چاپلوسی کہتے ہیں اور وہ بُری صفت سمجھی جاتی ہے۔ چاپلوسی اس وقت ہوتی ہے جب انسان کسی غیر حقیقی چیز کی تعریف کرے اور یہ انتہائی گھٹیا بات ہے کہ انسان کو خدا نے کمال وجمال اور عظمت وزیبائی کی تعریف کے لیے جو قوت دی ہے اسے وہ بے وقعت چیز کی تعریف میں لالچ کی غرض سے صرف کرے۔ یہ قوت تو اسے اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس سے اعلیٰ احساسات یعنی ایک کمال کی بزرگی، عظمت اور نظم وضبط سمجھ سکے۔ نہ کہ اسے غرض وطمع کے پست جذبات میں ضائع کرے۔ حقیقی تعریف کے لیے کسی طمع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ تو خوبصورت چیز دیکھنے پر انسان کا ایک فطری اور طبیعی ردِعمل ہے۔

مثلاً آج سے برسوں پہلے بایسنقر نے جو قرآنی ورق لکھا تھا اسے دیکھ کر انسان محوِ زیبائی ہو جاتا ہے اور بے اختیار اس کی تعریف کرتا ہے۔ اگر کوئی اس مقام پر انسان سے پوچھے کہ کیوں تعریف کر رہے ہو؟ کیا اس تعریف کا تمہیں صلہ ملے گا؟ تو ہم کیا جواب دیں گے؟

ہم کہیں گے کہ کیا ضروری ہے کہ معاوضہ ملے۔ میں انسان ہوں اور انسان ہونے کی حیثیت سے جب وہ عظمت و جلالت، جمال اور کمال کے روبرو ہوتا ہے تو خود بخود منکسر ہو جاتا ہے اور اپنے انکسار کو تعریف کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ یہی تعریف کا مفہوم ہے لیکن لفظ "حمد" صرف اس مفہوم کا احاطہ نہیں کرتا۔

انسان کی ایک خصوصیت اس کے اندر پاکیزگی کا احساس ہے۔ جسے سپاس گزاری کہتے ہیں جو لفظ "شکر" کا ترجمہ ہے۔ اور یہ جذبہ اس وقت متحرک ہوتا ہے جب انسان کے ساتھ بھلائی کی جائے۔ تب انسان کی انسانیت تقاضا کرتی ہے کہ بھلائی کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جائے۔

فرض کریں انسان اپنی گاڑی میں کہیں جا رہا ہے اور راستے میں کسی دوسری گاڑی کو پاتا ہے جس کے گزرنے کا حق مقدم ہے مگر وہ اپنی گاڑی روک کر ہمیں گزرنے دے تو انسانی آداب اور پاک فطرت کا تقاضہ ہے کہ لفظ "شکریہ" کہہ کر یا سر یا ہاتھ ہلا کر دوسرے شخص سے ممنونیت کا اظہار کیا جائے۔

یہ صفت اس حد تک حیوان میں نہیں پائی جاتی اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔

خدا قرآن میں سوال کرتا ہے:

هل جزاء الاحسان الا الاحسان

اس سوال کا مخاطب انسان کی فطرت سلیم ہے اور انسان کا پاک ضمیر اس کا جواب دیتا ہے۔

اور یہ مقولہ کہ اگر کوئی خود کو پہچان لے تو وہ خدا کو بھی پہچان لیتا ہے بہت درست ہے۔ انسان کی اپنی مکمل شناخت کا راستہ خدا کی معرفت پر ختم ہوتا ہے انسان کی شناخت کا ایک راستہ وہی خاص انسانی جذبات کی معرفت ہے اور ان جذبات میں سے ایک جذبہ بھی شکر ہے جو ضمیر پیدا کرتا ہے اور اس کا ماحول کی تعلیم و تربیت سے تعلق نہیں ہے اور نہ ہی مقامی رسم و رواج میں شامل ہے اور نہ کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ آداب و رسوم زمان و مکان کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات بالکل الٹ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سر سے ٹوپی اٹھانا اور رکھنا دونوں احترام کی علامتیں ہیں جو معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ کسی معاشرے میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ نیکی کا صلہ بدی دیا گیا ہو اور اس کی علاقائی رواج کے طور توجیہ کی جائے۔

تعریف نہ محض تعریف ہے اور نہ محض شکریہ ادا کرنا۔ پھر کیا ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں کو ملا دیا جائے تو تعریف ہے۔ یعنی کسی ایسی چیز کی تعریف کرنا جو عظمت جاہ، حسن، کمال اور خوبصورتی کی بنا پر قابل تعریف بھی ہے اور قابل تشکر بھی۔ اس لیے کہ اس سے احسانات اور نیکیاں ملتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس موقع کے لیے یہ لفظ "حمد" استعمال کیا گیا ہے۔

حمد خدا کے لیے مخصوص ہے

بعید نہیں کہ حمد کے معنی میں کوئی دوسرا مفہوم بھی دخیل ہو اور وہ مفہوم پرستش کا ہے۔

پس حمد کے مفہوم میں تین عناصر شامل ہیں:

تعریف، شکر اور پرستش۔

دوسرے لفظوں میں حمد، سپاس اور پرستش کے انداز میں تعریف ہے اس آیت کے مطابق جس میں کہا گیا ہے کہ حمد خدا کے لیے مخصوص ہے اور اس کے بغیر کوئی محمود نہیں، اس لیے ہے کہ حمد کے مفہوم میں پرستش کا مفہوم بھی ہے۔

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ:

"تمام "حمدیں" خدا کے لیے ہیں۔"

اگر لفظ "حمد" میں سپاس گزاری کے علاوہ عابدانہ خضوع و خشوع کا مفہوم نہ ہو اور "حمد" کا مفہوم صرف شکر ادا کرنا ہو تو کیوں نہ انسان ان انسانی وسائل کا بھی شکریہ ادا کرے جو خدا نے اس کے لیے پیدا کیے ہیں۔ وہ مخلوقات جن کے ذریعے خدا انسان کو خیر و برکت پہنچاتا ہے ان کی بھی قدر دانی اور سپاس گزاری کی جانی چاہیئے یہاں تک کہ کہا گیا ہے:

"من لم یشکر المخلوق لم یشکر الخالق"

"جو شخص مخلوق کا شکر ادا نہ کرے وہ خدا کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔"

ماں باپ، استاد اور وہ تمام لوگ جن کے وجود سے ہمیشہ انسان کو خیر و برکت ملتی رہی ہے سب کا شکر ادا کرنا چاہیے اور کبھی یہ عذر قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ چونکہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں لہٰذا بندوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں انھیں بھول جانا چاہیئے اور ان کی نعمتوں کا شکر بجا نہیں لانا چاہیئے لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ایک مقام پر بندے کا شکر ادا کیا جائے اور ایک مقام پر خدا کا۔ بلکہ جب آپ بندے کا شکر ادا کر رہے ہیں تو آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ بندہ آزاد

نہیں ہے اور جو چیز انسان کو اس بندے کے ذریعے ملی ہے اس سے پہلے خدا اس کے شکر کا مستحق ہے۔

پس چونکہ حمد اللہ کے لیے مخصوص ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معنی صرف سپاس گزاری نہیں بلکہ اس میں تعریف اور پرستش بھی شامل ہے۔

خداوند کی ذات ہی پرستش کے لائق ہے اور چونکہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے لہٰذا ہم اسی کی تعریف، شکر اور پرستش کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حمد انسان کا ایک اندرونی پاکیزہ جذبہ ہے اور یہ ہر انسان کی روح سے پھوٹتا ہے تاکہ جمال و جلال کی تعریف کرے اور عظمت کے مقابلے میں منکسر ہو یہی وجہ ہے کہ سورہ حمد خدا کی معرفت کی مقتضی ہے۔ یعنی جب تک انسان کو خدا کی مکمل معرفت حاصل نہ ہو جائے وہ سورہ حمد کو صحیح طرح سے پڑھ نہیں سکتا۔

مثال کے طور پر آپ ایک ایسے شخص سے ملتے ہیں جو بہت عظمت اور بزرگی کا مالک ہے اور آپ اسے صاحب فضیلت سمجھتے ہیں اور جب آپ کو اس سے واسطہ پڑتا ہے تو آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس نے کسی ذاتی غرض کے بغیر آپ کی ضرورت پوری کی۔ اور اس کی خیر و برکت سے آپ بہرہ ور ہوئے ہیں۔ اب جبکہ آپ اس شخص کی عظمت کے گرویدہ ہو چکے ہیں تو اگر اس شخص کا نام کسی محفل میں لیا جائے تو آپ گل کے سامنے بلبل کی طرح، عاشق وار اس شخص کی تعریف کریں گے اور تہ دل سے اس کی مدح سرائی کریں گے۔

یہ تعریف و توصیف آپ کی روح سے پھوٹتی ہے اور اکثر اوقات آپ اپنے اس عمل سے لذت اور سکون بھی پاتے ہیں۔

نماز میں انسان کی ایک عجیب حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہمارا عقیدہ

ہے کہ عبادت خدا کی شناخت کا تقاضا کرتی ہے۔ جب تک خدا کی معرفت مکمل نہ ہو جائے عبادت اپنے عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔

یہاں جو دلچسپ نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ الحمدللہ کے بعد خدا کی چار مزید صفات بیان کی گئی ہیں۔ رب العالمین، الرحمٰن اور الرحیم اور مالک یوم الدین۔ جو ہر ایک اپنی جگہ پر خدا کی معرفت کا دروازہ ہے۔ ان سب صفات کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔

چونکہ حمد کو صرف "اللہ" کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جو کہ تعریف اور پرستش کے لائق ذات ہے تو یہ اس ذات کے اعلیٰ ترین منصب کی دلیل ہے۔ یعنی وہ ذات جس کے کاموں اور میری ذات پر اس کے احسانات سے قطع نظر اور علم و دانش اپنی تخلیق اور اس وسیع کائنات کی ابتدا اور انتہا پر میرے غور کرنے سے پہلے ہی حمد کے لائق ہے اور مجھے اس کی تعریف کرنی چاہیئے۔ البتہ اس منصب کا دعویٰ ہر شخص نہیں کرسکتا۔

حضرت علی ابن ابی طالب کہتے ہیں کہ:

"الٰهي ما عبدتك طمعاً في جنتك
ولا خوفاً من نارك بل وجدتك اهلاً
للعبادة نعبدتك"

"اے پروردگار! یہ جو میں تیری عبادت کرتا ہوں
تو نہ تیرے بہشت کے لیے ہے اور نہ تیرے
دوزخ کے خوف سے۔ اگر تو جنت اور جہنم نہ بھی
پیدا کرتا تب بھی میں تجھے عبادت کے لائق ہستی سمجھ
کر تیری پرستش کرتا"

میری پرستش اس لیے نہیں کہ تو نے مجھے پیدا کیا اور مجھ پر احسان کیا اور نہ اس لیے کہ آخرت میں عبادت کرنے والوں کو بہشت دے گا بلکہ اس لیے ہے کہ تو پرستش کے لائق ہے[1]

بقول سعدی:

گر از دوست چشمت باحسان اوست
تو در بند خویشی نہ در بند دوست

خلاف طریقت بود کاولیاء
تمنا کنند از خدا جز خدا[2]

"رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

لفظ رب کے بارے میں کہنا چاہیے کہ دوسری زبان میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جو اس کا مترادف ہو۔ کبھی اس کا ترجمہ "پالنے والا" کیا جاتا ہے۔ لیکن واضح ہو کہ رب لفظ "ربب" سے ہے نہ کہ "ربی" سے۔ اور پالنے والا "مربی" کا مترادف ہے اور مربّی "ربی" سے نکلا ہے۔ کبھی رب کا ترجمہ "اختیار والا" کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عبدالمطلب نے کہا:

"انا رب الابل وللبیت رب"

---

[1] نہج البلاغہ میں عبادت کرنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو خدا کے احسانات پر اس کی عبادت کرتے ہیں اور وہ تاجر ہیں۔ ایک وہ جو ڈر کی وجہ سے خدا کی عبادت کرتے ہیں وہ بھی غلام ہیں اور تیسرا گروہ شکر کے لیے عبادت کرتا ہے اور یہی آزاد لوگوں کا گروہ ہے۔

[2] بوستان سعدی۔

"میں اونٹوں کا مالک ہوں اور گھر کا بھی ایک
مالک ہے۔"

بہرحال ان میں سے کوئی لفظ بھی اکیلا رب کا مفہوم ادا نہیں کرسکتا۔ اگرچہ یہ دونوں خدا کی الگ الگ صفتیں ہیں لیکن شاید رب کے لفظ میں بھی خداوندگاری او صاحب اختیار ہونے کا مفہوم پوشیدہ ہے اور یہ تکمیل کرنے والے اور پالنے والے کا مفہوم بھی دیتا ہے ور یہ خدا ہے جو عالم کا صاحب ختیار اور سب عالم کو تکمیل تک پہنچانے والا ہے۔

البتہ خدا نے کچھ ایسے جہان بھی پیدا کیے ہیں جن کی موجودات بعض خاص دلائل کی رو سے جو کمال رکھ سکتی تھیں وہ پہلے دن ہی سے رکھے ہوئے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ان میں کوئی استعداد اور قوت نہیں ہے بلکہ وہ سب اپنے عمل کو پہنچ چکے ہیں یعنی اسی دن جب وہ پیدا کیے گئے انھیں ممکنہ تمام کمال پر پیدا کیا گیا۔ یعنی ان کا آغاز اور انجام ایک ہے۔ وہ خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس کی مربوب ہیں اور خدا خالق کی حیثیت سے ان کا "رب"۔

یہ عالم فطرت باوجود اس کے کہ مجموعی طور پر دوسرے جہانوں سے الگ جہان ہے اور اس میں طرح طرح کی اشیا پائی جاتی ہیں۔ اور ہر قسم اپنے مخصوص نظام پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ درحقیقت ہر چیز کا اپنے لیے ایک الگ عالم ہے۔ سب اسی طرح ہیں عالم جماد، عالم نبات، عالم حیوان، عالم انسان، عالم افلاک۔ سب نقص سے تکمیل کی طرف گامزن ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی تخلیق کے وقت مکمل صورت میں پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ یہ خدا ہے جو ان جہانوں کی تمام موجودات کو آخری کمال تک پہنچاتا ہے۔ یہ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ہے

قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ اصولی طور پر یہ دنیا پرورش گاہ ہے۔ انسان

جو کہ مختلف اچھے بُرے گروہوں پر تقسیم ہیں سب پرورش پانے کی حالت میں ہیں
دلچسپ امر یہ ہے کہ دنیا کھیتی باڑی کے لیے ایک مناسب کھیت ہے جس میں جو بیج بھی بو دیا جائے پرورش پاتا ہے۔ اس کھیت میں نہ صرف اچھی چیزیں نشوونما پاتی ہیں بلکہ بری چیزیں بھی۔ یعنی جو لوگ برا بیج بوتے ہیں۔ وہ بھی اس دنیا میں اپنے مراحل طے کرتے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں کہا گیا ہے:

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا
مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ
جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَ
مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝
كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ
مَحْظُوْرًا ۝" (آیات ۱۸ تا ۲۰)

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا طالب ہو اور دنیا کا بیج بوئے ہم بھی اس کی مدد کرتے ہیں اور جو بیج اس نے بویا ہے ہم اس کا پھل دیتے ہیں لیکن جتنا کہ ہم چاہیں اور ہر شخص کے لیے جتنا ارادہ کریں۔

یعنی وہاں قطعی اور ناقابل تبدیل روایت کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ جو شخص اپنے کام کا نقد اور جلد نتیجہ چاہتے اسے دے دیا جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا پسندی کے بیج کا نتیجہ قطعاً سو فیصد نہیں ہے اس لیے کہ دنیا آفتوں، رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ دنیا ان بیجوں کی پرورش کے لیے نہیں بنائی گئی۔

بعد میں فرمایا گیا کہ یہ بات قطعی ہے کہ ایسا شخص جس نے اپنا مقصد صرف دنیا تک محدود کر دیا ہے اور انسانی راستے سے بھٹک گیا وہ ضرور جہنم میں جائے گا۔

لیکن اگر کوئی دنیاوی مقصد نہ رکھتا ہو اور آخرت کا بیج بوئے اور اس میں کوشش کرے تو یہ عمل ضائع نہیں ہوگا اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

" کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ "

" ہم اس گروہ کی بھی مدد کریں گے اور اس گروہ کی بھی"

مختصر یہ کہ اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ جو کوئی جس چیز کا بیج بھی بوئے گا یہ زمین اس کی نشوونما کے لیے موزوں ہے اور اس بیج کی نشوونما کرے گی لیکن ایک بیج ایسا بھی ہے جو سو فیصد پھلے پھولے گا اور وہ صراطِ مستقیم کا بیج ہے بعض بیج ایسے ہیں جن کی نشوونما کا امکان تو ہے لیکن ان کے نتیجے پر پہنچنے کا کوئی کلیہ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ناجائز کام کرتے ہیں وہ اپنے عمل کی یہ توجیہ نہیں کر سکتے کہ اگر ہمارا کام قابلِ اعتراض ہوتا تو ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچتے۔

نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے جو نظریہ عمل میں نتیجہ خیز ہو وہ اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے یہ دنیا کا نظام ہے کہ:

" کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ "

جو کوئی جو بیج بوتا ہے وہ نشوونما پاتا ہے اور اپنا مطلوبہ نتیجہ حاصل کر لیتا ہے۔

" الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "

پہلے ان الفاظ کے بارے میں کسی حد تک بحث ہو چکی ہے اور یہاں

مزید یہ کہنا ہے کہ پروردگار کی صفت بیان کرنے کے لیے مذکورہ دو صفات سے مکمل آگاہ ہونا ضروری ہے کیونکہ رحمٰن یعنی وہ جس کی رحمت فراواں ہے۔ ہمیں لفظ "فراواں" سے اس کی مقدار کا تعین نہیں کرلینا چاہیئے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام کائنات اسی سے ہے اور اس سے جو کچھ بھی ملتا ہے رحمت اور برکت ہے۔ رحیم یعنی وہ جس کا فیض ہمیشہ انسانوں تک پہنچتا ہے۔

ان دونوں صفات میں پہلی صفت نظام کائنات سے متعلق ہے اور دوسری خاص انسانوں کے لیے ہے۔ پروردگار کی تعریف کے لیے انسان کے لیے پہلی صفت کا اس قدر گہرا مطالعہ ضروری ہے کہ وہ دنیا کو سراسر رحمت دیکھے اور اسے ثنویت کا خیال چھو کر بھی نہ گزرے اور نہ ہی وہ موجودات کو خیر و شر میں تقسیم کرے بلکہ تمام کائنات کو اس دلیل کے ساتھ کہ خدا کی بنائی ہوئی ہے سراپا خیر و رحمت سمجھے۔ یہ وہی مسئلہ ہے جو "عدل الٰہی" میں پیش آتا ہے۔

یہ وہ نکتہ ہے جو انسان کو ہمیشہ خود سے بیان کرتے رہنا چاہیئے۔

خدا کو رحمٰن کی صفت کے ساتھ پہچاننا، جہان کو پہچاننے کے مترادف ہے جو خدا کی حکمت بالغہ اور خدا کے مکمل نظام کا مظہر ہے۔ اس صفت کے ساتھ اللہ کی تعریف کرتے وقت انسان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ نظام کائنات، خیر و برکت کا نظام ہے۔ رحمت کا نظام ہے، نور کا نظام ہے۔ شر اور ظلمت نسبی اور غیر حقیقی امور ہیں۔

ظاہر ہے سر خام نظریے کا یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ میرا کائنات کے بارے میں نظریہ یہ ہے اور نہ ہی انسان زبردستی اپنے اندر ایسا تصور پیدا کرسکتا ہے۔

اب قرآن ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ خدا کی ان صفات کے ساتھ ثنا بیان کی جائے۔ خدا کی اور اس کی کائنات کی اسی نہج پر شناخت ہو۔ شناخت کے اس طریقہ

کا مطلب ہے کہ ہم نے عقل و برہان کے صحیح راستے کے ذریعے اعلیٰ مسائل کا ادراک کیا ہے اور یہ ضمنی طور پر الٰہیات کے مسائل میں تفکر کی دعوت اور ایسی معرفتوں کے امکان کی تائید ہے۔

صفت "رحیم" کے حوالے سے اللہ کی شناخت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان موجوداتِ عالم کے درمیان اپنے مقام کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہے۔

انسان اور دوسری موجودات میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کا بالغ بیٹا ہے۔ ایسا نابالغ فرزند نہیں جو والدین کی جبری سرپرستی میں رہتا ہے۔ بلکہ عقل و خرد میں اس کی بلوغت اس درجہ تک ہے کہ اس سے کہا گیا ہے کہ تم خود اپنا راستہ انتخاب کرو۔ جبکہ دیگر موجودات اس کائنات کے جبری عوامل کے زیر کفالت ہیں۔ یہ انسان ہے جو اپنی عقلی بلوغت کی بنا پر آزادی اور اختیار کا مالک ہے اور دو راستوں میں سے ایک راستہ منتخب کرسکتا ہے۔

"إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا"

(سورۂ دھر آیت ۳)

سیدھا اور ٹیڑھا دونوں راستے انسان کے سامنے رکھے گئے۔ اگر انسان راہِ راست اور صراطِ مستقیم پر چلے تو اس وقت خدا کی خاص رحمت اور عنایت اس کے شاملِ حال ہوجاتی ہے۔ یعنی اس دنیا کا نظام اس انداز میں بنایا گیا ہے کہ جو شخص خدا کے راستے پر چلے پروردگار اس کی مدد کرتا ہے۔ اس کی رہنمائی اور ہدایت کرتا ہے۔

"وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا"

اس کے دل کو نور اور قوت بخشتا ہے۔ اس کے لیے اسباب پیدا کرتا ہے۔

"من حیث لا یحتسب"

کا رزق فراہم کرتا ہے اور آخر کار اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خدا سے داد و ستد کے مرحلے پہ پہنچ گیا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ جس قدر مخلصانہ کردار اپناتا ہے زیادہ سے زیادہ خدا کی عنایت اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب بندہ تسلیم و رضا کے مرحلے پہ پہنچ جاتا ہے۔

"مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ"

آپ نے دینی رسائل میں پڑھا ہوگا کہ نماز میں اس آیت کی قرارت دو طرح سے ہو سکتی ہے مالک یوم الدین اور ملک یوم الدین۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا یہ دو مختلف قرائتیں دو الگ الگ مفہوم رکھتی ہیں؟

"ملک" اور "مالک" روزمرہ کے استعمال میں اپنا اپنا مفہوم رکھتے ہیں ملک کا تعلق سیاست سے ہے اور مالک کا تعلق معیشت سے ہے۔ جب انسان کا کسی چیز سے مالکیت کا رابطہ قائم ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک دوسری قوت ہے جو اپنے لیے تدبیر و سیاست کے حق کی قائل ہے۔

لیکن ان دونوں معاملات میں کوئی واقعیت نہیں ہے بلکہ محض ایک مفروضہ ہے۔ یعنی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں گھر کا مالک ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فی الوقت اسے یہ اعتبار حاصل ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں علاقے کا ملک ہے تو یہ بھی اس شخص کو صرف معتبر کرنے کے لیے ہے۔ لہٰذا اگر دونوں معاملات میں اعتبار تبدیل ہو جائے تو بلا تاخیر پہلی مالکیت ختم ہو جائے گی یعنی ممکن ہے کہ اگلے ہی لمحے اس گھر کا مالک اور اس علاقے کا ملک کوئی دوسرا شخص ہو اور ان اشیا کا تعلق نئے لوگوں سے استوار ہو جائے۔

ان معاملات میں مُلک اور مالک ہونا صرف معتبر بننے کے لیے ہے اور یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے سے مختلف مفہوم رکھتے ہیں۔ یعنی مَلِک، مالک کا کام نہیں کرتا اور مالک، مَلِک کے کام نہیں انجام دے سکتا۔ ایک مُلک ہے اور دوسرا مِلک۔

لیکن بعض معاملات میں یہ تعلقات حقیقی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میں اپنے بدنی قویٰ کا مالک ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان قویٰ سے استفادہ کرنے میں صاحبِ اختیار ہے۔ یعنی میرے جسم میں جو قوت موجود ہے میں اس سے جب چاہوں فائدہ اٹھاؤں۔ اور مثلاً مجھ میں قوتِ گویائی ہے۔ میں جب چاہوں بولوں جب چاہوں چپ رہوں۔

اس مقام پر مَلِک، مالک کے مصداق دکھائی دیتا ہے۔ یعنی ہم اپنے اعضاء کے مالک بھی ہیں اور ان پر تسلط بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ ایک تکوینی امر ہے محض مجازی نہیں۔

پروردگار کے معاملے میں جو کہ تمام جہان کا خالق ہے اور اس کا ارادہ تمام عالم پر قاہر ہے، مَلِک کا مالک کے ساتھ یکجا ہونا اچھی طرح واضح ہے اور اسی وجہ سے مالک اور مملوک کے درمیان حقیقی رابطہ استوار ہے۔ لہٰذا قرآن میں قیامت کے دن مُلک کے بارے میں آیا ہے:

"لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" (سورۂ مومن آیت ۱۶)

اس سے بڑھ کر ایک دوسری آیت میں آیا ہے:

"قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ"

"کہو اے خدائے مالک الملک"

اس آیت میں ایک مملوک معاملے میں سرپرستی کے لیے ایک "مَلک" اور "صاحب اختیار ہستی" کو فرض کیا گیا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ کا بھی یہی مفہوم ہے اور اصطلاح میں "لام" ملک کا مفہوم ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ:

" مالک کون ہے؟"

جواب یہ ہے کہ:

" خدا ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ مَلک اور مِلک ایک دوسرے سے اتنے دُور نہیں ہیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے ان کی دو الگ الگ حکومتیں نہیں ہیں۔

لیکن کیا خدا صرف روز قیامت کا مالک اور مَلک ہے اور دنیا میں ایسا نہیں ہے؟

نہیں، بلکہ خدا دنیا اور آخرت دونوں کا حقیقی مالک اور مَلک ہے۔ فرق یہ ہے کہ چونکہ انسان دنیا میں حقیقت بین آنکھ نہیں رکھتا لہٰذا وہ معتبر کرنے کے لیے مجازی مالک اور ملک بنا لیتا ہے۔ خود کو اور دوسروں کو اشیاء کا مالک اور ان کا مَلک تصور کرتا ہے اور کہتا ہے میں اس گھر کا مالک ہوں۔ لیکن جب اس پر جہان کے حقائق واضح ہوئے اور اس نے دنیا پر حقیقت آمیز نظر ڈالی تو اسے پتہ چل جائے گا کہ تمام مَلک اور مالک بناوٹی تھے اور حقیقی مالک اور مَلک خدا ہے۔

ولقد کشفنا عنك غطاءك فبصرك
اليوم حديد۔

مندرجہ ذیل روایت سے بھی یہی پتہ چلتا ہے:

" عن جابر عن ابی جعفرؑ انہ قال

الامر یومئذ والیوم کلہ للہ یا جابر
اذا کان یوم القیامہ بادت الحکام
فلم یبق حاکم الا اللہ۔

(المیزان ج ۲۰۔ص ۲۲۹)

"اِیَّاکَ نَعْبُدُ"

"پروردگار ہم صرف تجھے اور تجھے پوجتے ہیں"

اگرچہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ توحید ایک اسلامی مسئلہ ہے اور اسلام میں توحید کے ساتھ دوسرے ہزاروں مسائل موجود ہیں۔ لیکن جب ہم گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام سراسر توحید ہے یعنی کیا وہ مسائل جو اصول عقائد سے متعلق ہیں اور کیا وہ مسائل جو اخلاقیات اور تربیتی امور اور روزانہ کے احکام کے بارے میں ہیں سب کے سب توحید ہیں۔

علم منطق کی ایک اصطلاح "تحلیل وترکیب" ہے۔ یہ دو کلمات علوم طبیعی سے لیے گئے ہیں۔ جن کا مفہوم یہ ہے کہ عالم مادہ میں تجزیہ وترکیب شامل ہے۔ یعنی تمام مرکبات کے ابتدائی عناصر کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔ اگر ان عناصر کو دوبارہ ملا دیں تو اس سے مرکب بنتا ہے۔ افکار وخیالات میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ فلاسفر کہتے ہیں کہ تمام انسانی افکار عدم تناقض کے اصول کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ یعنی اگر تحلیل اور تجزیہ کیا جائے تو اس مسلّمہ اصول کی طرف اس کا لوٹنا بدیہی امر ہے۔

اسلام میں اس اصول کا نام توحید ہے۔ یعنی ہم اگر تمام اسلامی اصولوں کا تجزیہ کریں تو وہ توحید ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔

مثلاً نبوت اور معاد ہی کو لے لیجیے جو ہمارے اعتقادات کے دو بنیادی اصول ہیں۔ ان کے تجزیہ کی دوسری شکل توحید ہے۔ اگر اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی

احکام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ بھی توحید کی صورت میں خود نمائی کریں گے۔ اس موضوع پر تفسیر المیزان میں خاطر خواہ تفصیل موجود ہے۔

نظری توحید اور عملی توحید

اسلام میں دو قسم کی توحید ہے۔ ایک نظری اور ایک عملی۔

نظری توحید کا تعلق شناخت اور فکر کی دنیا سے ہے۔ یعنی خدا کو ایک پہچاننا۔

عملی توحید۔ یعنی خود کو عمل میں ایک بنانا اور واحد ذات کی جہت میں رکھنا۔

دوسرے لفظوں میں نظری توحید یعنی خدا کو ایک پہچاننا اور عملی توحید یعنی انسان کا ایک ہونا۔

میں یہاں جس نکتے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سورہ حمد میں جو کچھ ابتدا سے کر اس آیت تک مذکور ہوا ہے وہ نظری توحید ہی سے متعلق ہے اور یہاں (اِیَّاکَ نَعْبُدُ) سے بعد عملی توحید کا بیان ہے۔

اسی مقام پر انسان اس مختصر سی سورہ کی بے مثال عظمت سے آگاہ ہوتا ہے اور اس کتاب کریم کے معجزے کو اس چھوٹی سی سورہ میں دیکھتا ہے۔ انسان اپنی حیرت کو چھپا نہیں سکتا کہ جہالت اور علم و تہذیب سے بے خبری کے ماحول میں کس طرح ایک اُمّی شخص کی زبان پر ایسی باتیں جاری ہوئی ہیں جو گہرائی کے لحاظ سے عظیم ترین حکمائے الٰہی کو بھی غور و فکر پر مجبور کر دیتی ہیں اور ان میں ایسی سلاست اور مٹھاس ہے کہ انسان بار بار دہرانے سے بھی سیر نہیں ہوتا۔

اس موضوع کی وضاحت ہم یوں بھی کر سکتے ہیں کہ ابتدائے سورہ سے

لے کر" مالک یوم الدین" تک جو جملات اور کلمات گزرے ہیں وہ خدا کی شناخت کے بارے میں ہیں۔ یعنی وہ "اللہ" ہے، "رحمان" ہے، "رحیم" ہے، "رب العالمین" ہے۔ "مالک یوم الدین" ہے۔ علاوہ ازیں وہ ذات "محمود" بھی ہے۔ سب حمدیں اور شکر اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام الہیات انھی چند کلموں میں سمٹ آئی ہے اور اللہ سے متعلق بہترین مسائل انہی چند آیتوں میں بیان ہوگئے ہیں۔

علماء اور حکمائے اسلام کا یہ اخذ کرنا بالکل درست ہے کہ قرآن کی طرف سے ایسے مسائل کا پیش کیا جانا ان حقائق پر غور و فکر کی دعوت ہے۔ قرآن نہیں چاہتا کہ ہم صرف زبان سے یہ آیت بیان کر دیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ہم ان کے حقائق کو بھی سمجھیں۔

جو شخص نماز میں خدا کو مذکورہ اوصاف کے ساتھ یاد کرتا ہے وہ حقیقت میں ان اسماء اور صفات کے ذریعے خدا کی شناخت کے مقام پر ہے۔

شناخت یہ ہے کہ وہ "اللہ" ہے۔ یعنی وہ مکمل اور قابل پرستش ذات ہے جس کی طرف تمام موجودات عالم فطری طور پر متوجہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسے وجود کی شناخت، اقرار اور اعتراف ہے جو کامل مطلق ہے اس میں کوئی نقص کمی و بیشی اور ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب چیزیں اسی سے ہیں اور اسی کی طرف متوجہ ہیں۔

شناخت یہ ہے کہ وہ "رحمٰن" ہے۔ واقعی انسان کے افکار اتنے لطیف اور دقیق ہونے چاہییں کہ وہ خدا کو رحمت کی صفت سے پہچان سکے۔ یعنی وہ یہ سمجھ سکے کہ جو وجود سراسر رحمانیت کا مظہر ہے وہ ذات حق ہے۔ اس سے جو امر بھی واقع ہوتا ہے وہ خیر و رحمت کے سوا کچھ نہیں۔ کوئی موجود اس لیے کہ وہ موجود ہے اور ذات حق سے نسبت رکھتی ہے یعنی عینی اور واقعی ہے وہ خیر و

رحمت کے سوا نہیں ہے۔ اشیاء کا شر ان کا عدمی، نسبی اور اضافی پہلو ہے۔ وہ فی نفسہ بُری نہیں ہیں۔ ۱؎

شناخت یہ ہے کہ وہ رحیم ہے جو بندہ خدا کو اس صفت کے ساتھ پکارتا ہے وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ معرفت و شناخت کے اس مرحلے تک جا پہنچا ہے کہ نہ صرف نظامِ تخلیق اور ذاتِ حق کی مظہر اشیاء کے ظہور کو تشخیص دے سکتا ہے بلکہ اشیاء کی رجعت کا نظام بھی جانتا ہے جو حق کی طرف ہے اور پُر خیر و رحمت ہے یعنی موجودات رحمت کی طرف سے آئی ہیں اور رحمت کی طرف چلی جائیں گی۔

اس سے رحمت کی غضب پر فوقیت کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر غضب کی صحیح شناخت ہو جائے تو وہ بھی عذاب کے لباس میں رحمت ہی ہوتی ہے

خدا تعالیٰ میں جمال و جلال کی صفات ہیں۔ جمال کی صفتوں میں علم، قدرت حیات، جود اور رحمت شامل ہیں۔ اور جلال کی صفات میں قدوسیت، جباریت اور منتقمیت اور اس قسم کی صفتیں شامل ہیں۔

خدا تعالیٰ اپنی ذات کے مرتبہ میں دوئی کا حامل نہیں ہے۔ مثلاً اس کی بصفت ذات رحمت، خیر، جود اور ربوبیت ہو اور بصفت ذات قدوسیت، جباریت اور منتقمیت۔

اور اس طرح خدا جس حیثیت اور مرتبہ میں خیار، جواد اور رحمان ہے جبار اور انتقام لینے والا نہیں۔ بلکہ اس کے اسماء اور صفات میں ایک قسم کا تقدم اور تاخر حکم فرما ہے۔

اہل حکمت و معرفت نے اس بارے میں بہت عمیق اور دلچسپ تحقیقات

۱؎ استاد مرتضیٰ مطہری نے اس مسئلے کی وضاحت اپنی کتاب "عدل الٰہی" میں کی ہے۔

کی ہیں جو انسانی فکر کی بہترین ماحصل ہیں اور صرف وہی ان حقائق کی گہرائی تک پہنچتے ہیں جو وافر اور متواتر غور و فکر کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

پروردگار کی صفات میں ایک قسم کا تقدم و تاخر موجود ہے۔ یعنی بعض اسماء دوسرے اسماء اور صفات کے پیدا کردہ ہیں۔ جمالیہ صفات کلی طور پر جلالیہ صفات پر مقدم ہیں کیونکہ جلالیہ صفات جمالیہ صفات کی پیدا کردہ ہیں۔ جس ذات کی جباریت اور انتقام کی صفت دوسری صفتوں پر مقدم ہے وہ یہود کا بناوٹی خدا "یہوہ" ہے نہ کہ قرآن کی طرف سے متعارف شدہ دنیا کا حقیقی خدا "اللہ"۔

یہاں یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ قرآن کی "بسم اللہ" کیوں رحمٰن اور رحیم کے ساتھ ہے اور جبار و منتقم کے ساتھ کیوں نہیں۔ کیونکہ قرآن کی رو سے ہستی کی نمائش رحمان اور رحیم اللہ کی نمائش ہے۔ حتیٰ کہ جباریت اور منتقمیت بھی رحمانیت اور رحیمیت کی ایک دوسری شکل ہے۔

بے شک ظاہر ہے کہ رحمت رحیمیہ سے مراد وہ رحمت ہے جو حق کی طرف لوٹنے والی موجودات میں شامل ہے۔ پہلے درجہ میں یہ اہل ایمان کے شامل حال ہے یعنی یہ لوگ ہیں کہ ان سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے وہ ظاہری اور باطنی لحاظ سے رحمت ہے اور یہ رحمت، رحمت کی صورت میں ہے، عذاب کے لباس میں نہیں۔ یہ رحمت مطلق ہے نسبی نہیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ رحمان اور رحیم کے درمیان فرق یہ ہے کہ رحمان دنیا سے متعلق ہے اور رحیم آخرت سے۔ یا رحمان کیا کافر کیا مومن سب پر محیط ہے لیکن رحیم صرف مومنوں کے شامل حال ہوتا ہے تو اس سے مراد وہی ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے۔

دنیا اور آخرت اس لحاظ سے کہ دو جہان ہیں ایک دوسرے سے مختلف

نہیں ہیں اور یہ کہ ایک جہان کی رحمت کا مادہ "رحمان" ہے اور دوسرے جہان کی رحمت کا مادہ "رحیم" یا کافروں اور مومنوں کے شامل حال رحمتیں ایک مادہ سے متعلق ہیں اور اہل ایمان کے لیے خاص رحمتیں دوسرے مادہ سے۔

کائنات کی اس قسم کی تقسیم نہیں ہوئی بلکہ رحمت کے نقطہ نظر سے کائنات کی تقسیم یوں ہوئی ہے کہ دُنیا کی "آمد" ہے اور "واپسی" ہے اور یہ آمد خدا کی طرف سے اور واپسی بھی اسی کی طرف ہے۔ خداوند رحمان ہے یعنی کائنات کا آنا اوری کی طرف سے آنا۔ رحمت کا مظہر ہے۔ خدا رحیم ہے یعنی کائنات کا خدا کی طرف جانا بھی رحمت کا مظہر ہے۔ حتیٰ کہ جہنم اور عذاب الہیٰ جو کہ خدا کی جباریت اور انتقام کا مظہر ہے۔ اس کی رحیمیت کی پیداوار ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

وہ "مالک یوم الدین" ہے۔ یہاں ایک دوسری معرفت اور شناخت کا مسئلہ پیش ہوتا ہے۔

بندہ تخلیق کے انجام کی شناخت کا مدعی ہے یعنی جو کچھ وہ جانتا ہے وہ روز جزا ہے اس دن یہ منکشف ہوگا کہ کوئی سبب اور وسیلہ اصل نہیں، اصل ملک اور مالک خدا ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے یہ نظری توحید سے متعلق ہے۔ یعنی وہ توحید جو شناخت سے متعلق ہے اور یہ شناخت غیر معمولی طور پر لازمی اور ضروری ہے۔ کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ مرحلہ ایک ذہنی مرحلہ ہے اور اس کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسلام میں شناخت کی اپنی اصالت ہے اور جب تک یہ مرحلہ طے نہ ہو جائے انسان عمل میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔

لیکن کیا یہ مرحلہ کافی ہے؟ یعنی انسان صرف پہچان لینے اور سمجھ لینے

سے موحد سمجھا جائے۔

نہیں۔ بلکہ یہ پہچاننا اور سمجھنا "ہونے" کا مقدمہ ہے یعنی پہچانے اور سمجھے تاکہ (عملی توحید) ممکن ہو۔

جب ہم "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کہتے ہیں تو گویا ہم نے عملی توحید کا آغاز کیا اور ہم ایک ہونے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔

لفظ عبادت کا مأخذ

عربی زبان میں جو چیز رام، نرم اور مطیع ہو ایسی مطیع کہ اس میں سر اٹھانے اور مدافعت کرنے کی قوت نہ ہو تو اس حالت کو "تعبّد" کہتے ہیں۔

پرانے زمانے میں راستے اور سڑکیں ایسے نہیں تھے جیسے اب ہیں۔ آج مشینیں پہلے راستہ بناتی ہیں پھر اس پر چلا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں چلنے کے ساتھ ساتھ خود بخود ہی راستے بن جاتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں پتھر اور کانٹے آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے لیکن چلتے چلتے پتھر کنکر بن جاتے اور نرم ہو جاتے تھے۔ اور چلنے والوں کے آگے مدافعت نہیں کر سکتے تھے اور نہ انسانوں اور حیوانوں کو تکلیف پہنچا سکتے تھے۔ بلکہ وہ رام اور مطیع ہوتے تھے۔ لیکن جس راستے پر آمد و رفت نہ ہوتی وہاں پتھر پاؤں کے تلے چبھتے۔ اس راستے کو جو نرم اور رام ہو چکا ہوتا "طریق معبد" کہتے۔

عبد اور معبد جو رام اور تسلیم ہو چکا ہے اور کسی قسم کی بغاوت نہیں کرتا اس کا اس طرح رہنا یعنی رام اور مطیع ہونا، قطعاً باغی نہ ہونا وہ حالت ہے جو انسان صرف خدا کے لیے رکھ سکتا ہے۔ خدا کا عبد ہونا۔ یعنی اس حالت کو خدا کے احکام کے تئیں روا رکھنا۔ لیکن عبد ہونے اور عبادت میں توحید کا مطلب یہ ہے کہ دوسری کسی

موجود اور کسی شخص کے سامنے یہ حالت روا نہ رکھے بلکہ غیر خدا کے سامنے سرکشی کی حالت رکھے۔ پس انسان میں ہمیشہ دو حالتیں ہونی چاہئیں:

خدا کے لیے تسلیم محض

اور

غیر خدا کے لیے مطلق سرکشی۔

لہٰذا اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا مطلب یہ ہے کہ میں صرف تیری پرستش کرتا ہوں اور تیرے علاوہ کسی کی پرستش نہیں کرتا۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ خدا نے جن لوگوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے مثلاً والدین، امام اور معاشرے کے پیشوا۔ ان کی اطاعت بھی درحقیقت خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ ہم خدا کے حکم کے مطابق اطاعت کرتے ہیں اور جو امر اس کے مطابق عمل میں آئے وہ خدا کی عبادت ہے۔ لیکن جو چیز خدا کے ساتھ ٹھہرائی جائے یعنی اس کے مقابلے میں تو وہ شرک ہے۔

شرک اور توحید

قرآن مجید میں شرک کے کئی قسم کے مترادفات آئے ہیں ہم ان میں سے بعض مترادفات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جن سے قرآن کی پیش کردہ عملی توحید بھی واضح ہو جاتی ہے۔

"اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ"

(سورہ فرقان ۴۳)

"کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنے نفس کی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔"

اس آیت میں شہوت پرست انسان کو مشرک قرار دیا گیا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

مادرِ بُت ہا بُتِ نفسِ شماست
چونکہ آں بُت مار و ایں بُت اژدہاست

آہن و سنگ است نفس بت شرار
آں شرار از آب می گیرد قرار

سنگ و آہن ز آب کی ساکن شود
آدمی با این دو کی ایمن شود

پس جب ہم اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہتے ہیں اور غیرِ خدا کی معبودیت کی نفی کرتے ہیں تو ہم اس بات کے مدعی ہوتے ہیں کہ اے خدا ہم تیرے فرماں بردار ہیں نہ کہ اپنی خواہشوں اور شہوتوں اور ہوسوں کے۔

"اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔"

(سورۂ توبہ آیت ۳۱)

قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"انھوں نے خدا کے حکم کے بغیر اپنے مذہبی پیشواؤں
اور راہبوں کو اپنا خدا بنا لیا ہے اور ان کی پرستش
کرتے ہیں۔"

یہودی اور عیسائی اپنے علما اور مقدس شخصیتوں کی ویسی عبادت نہیں کرتے تھے جیسے بت پرست بتوں کی کرتے ہیں۔ مثلاً وہ انھیں سجدہ نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا تھا کہ وہ ان کے سامنے متعبد تھے یعنی خدا کی اجازت کے بغیر وہ ان کے

مطیع اور تسلیم تھے۔ درحقیقت وہ ان کی نفسانی خواہشات کے مطیع تھے۔ جو کچھ وہ اپنی خواہش کے مطابق کہتے یہ تسلیم کرتے۔

اس مقام پر خدا فرماتا ہے کہ اطاعت صرف پروردگار کا خاص حق ہے۔ وہ جس شخص کو حکم دے اس کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔ احبار اور راہبوں کی اطاعت کا خدا نے حکم نہیں دیا تھا پھر ان کی کیوں اطاعت کرتے ہو؟

پس جب ہم کہتے ہیں اِیَّاكَ نَعْبُدُ تو اس کا یہ مطلب بھی ہوتا ہے کہ اے خدا ہم کسی مقدس اور روحانی گروہ کی عبادت نہیں کرتے۔ اندھی اطاعت نہیں کرتے جس کے بارے میں تو نے حکم دیا ہے کہ اطاعت کریں تو ہم کریں گے اور جس کے بارے میں تو نے حکم نہیں دیا اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔

"قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ"

(سورہ آل عمران آیت ۶۴)

یہ وہی آیت ہے جسے رسول اللہ ؐ نے ۵ یا ۶ ہجری میں خط کے طور پر سربراہان عالم کو بھیجا تھا:

"کہو اے اہل کتاب! اے وہ لوگو جو خود کو ایک آسمانی کتاب سے مستند کرتے ہو، سب ایک حقیقت کی طرف آؤ جو ہم سب کے لیے یکساں ہے نہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صرف ہم سے متعلق ہے نہ آپ

دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آپ کے لیے مخصوص ہے وہ (حقیقتاً)
اللہ ہے۔ آئیں کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں۔
ولا یتخذ بعضنا بعضا ۔۔۔۔۔۔۔

ہم سے کچھ لوگ کسی دوسرے کو "رب" اور صاحب اختیار نہ مان لیں۔ ہم کسی دوسرے کی عبادت اور اطاعت نہ کریں۔ اسے معبود اور مطاع نہ بنائیں۔ صرف خدا کو "رب" اور معبود و مطاع سمجھیں۔

قرآن کی یہ آیت عملی توحید کی مظہر ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا رب قرار دے اور کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا مربوب نہ بنائے پس اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہم صرف تجھے "رب" اور مطاع سمجھتے ہیں۔ ہمارا کوئی اجتماعی معبود نہیں اور کسی انسان اور اس کے حکم کو تیرے اور تیرے حکم کے سامنے مطاع قرار نہیں دیتے۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَ
بَنِي إِسْرَائِيلَ ۔

(سورۃ شعراء آیت ۲۲)

جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے سامنے گئے اور اسے دعوتِ حق دی تو فرعون نے رعونت سے کہا:

"تم وہی ہو نا جو ہمارے گھر میں پلے بڑھے اور وہ بُرا کام انجام دیا؟" (قبطی کے مارنے کی طرف اشارہ ہے)

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

"اب مجھ پر یہ احسان کرتے ہو جب کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا بندہ بنایا ہوا ہے؟"

یعنی کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھارے بنی اسرائیل کو بندہ بنانے کے عمل کے مقابلے میں تجھے کچھ نہ کہوں؟

ملاحظہ کیا آپ نے کہ حضرت موسیٰؑ، فرعون کی۔ یعنی فرعون کے استبداد کو "تعبید" کا نام دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے کبھی فرعون کو سجدہ نہیں کیا۔ بلکہ فرعون نے انھیں ذلیل کیا اور انھیں جبری اطاعت پر مجبور کیا اور ان سے ہر قسم کا اختیار اور آزادی چھین لی۔ وہ فرعون کے سامنے عملاً رام اور مطیع تھے۔

پس اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا مفہوم ہے کہ:

"اے خدا ہم تعبید، تذلیل اور جبری اطاعت قبول نہیں کریں گے اور اپنا حق آزادی سلب نہیں ہونے دیں گے۔"

مختصر یہ کہ اسلام میں اتنا کافی نہیں کہ مسلمان صرف فکر و خیال کی حد تک موحد ہو اور خدا کو محض صفات اور افعال کی حد تک ایک سمجھے اور جانے اور اگر اس سے الٰہیات پر بحث کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ خدا کی چھ صفتیں بیان کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔

ایسا شخص آدھی توحید رکھتا ہے۔ باقی آدھی توحید یہ ہے کہ وہ عملاً توحید کی طرف مائل ہو بلکہ اس میں موحد ہو چکا ہو جب اس نے خدا کو تمام اوصاف کے ساتھ پہچان لیا اور اطاعت و تسلیم میں یگانہ ہو گیا تو وہ موحد کہلوا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسی مقام پر سورۂ فاتحہ کی عظمت واضح ہوتی ہے اور واقعی یہ بات حیران کن ہے کہ جس شخص نے عمر بھر سبق نہیں پڑھا۔ کسی فیلسوف سے نہیں ملا۔ کسی دانشور سے ملاقات نہیں کی وہ اپنی کتاب کی پہلی سورت ہی میں جملوں کو اس طرح پیش کرے کہ اپنا سارا مکتبِ فکر ایک چھوٹی سی سورۃ میں سموئے

نظری توحید کو چند مختصر جملوں میں کمال عظمت کے ساتھ بیان کرے اور عملی توحید کو ایک مختصر جملے اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں واضح کر دے۔

عبادت کا اختصاص

مذکورہ آیت میں عربی زبان کی گرامر کی رُو سے اِیَّاكَ مفعول ہے نَعْبُدُ کا اور طبع اولیٰ کے باعث اسے فعل کے بعد آنا چاہیے اور نعبدک کہنا چاہیے اگر ایسا ہوتا تو اس کا مطلب ہوتا:

"اے خدا ہم تیری پرستش کرتے ہیں۔"

لیکن علمائے ادب کہتے ہیں کہ:

"تقدیم ما حقہ التاخیر یفید الحصر۔"

یعنی "اگر کسی لفظ کی جگہ بعد میں ہو اور اسے پہلے لے آیا جائے تو وہ اختصاص کی علامت ہے۔"

اس قاعدے کی رُو سے مذکورہ آیت کے معانی یہ ہیں:

"اے خدا ہم صرف "تیری ہی" عبادت کرتے ہیں اور تیرے ہی رام اور مطیع ہیں اور تیرے علاوہ کسی شخص اور کسی ایسے حکم کی پیروی نہیں کرتے جو تیرے حکم کے مطابق نہ ہو۔"

پس اِیَّاكَ نَعْبُدُ دو جملوں کی جگہ ایک جملہ ہے۔ ایک اثباتی جملہ ہے۔ یعنی ہم خدا کے سامنے تسلیم ہیں اور ایک منفی جملہ ہے یعنی غیر خدا کے سامنے ہرگز تسلیم نہ ہوں گے۔

اس طرح اس جملے میں وہی ایمان اور انکار بیان ہوا ہے جو کلمۂ توحید میں ہے یعنی جب کوئی مسلمان کہتا ہے لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ تو ایک ہی وقت میں وہ ایمان کا اقرار کرتا ہے اور انکار کا اظہار بھی کرتا ہے :

ایمان خدا پر ـــــ اور ـــــ انکار غیرِ خدا کا۔

آیۃ الکرسی میں ہم پڑھتے ہیں :

" لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ۚ

(سورۃ بقرہ آیت ۲۵۶)

اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ کسی قسم کا کوئی جبر و اکراہ نہیں جو شخص بیک وقت اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور طاغوت (جو کہ سرکشی کا مظہر ہے) سے انکار کرتا ہو وہ نجات پانے والا ہے اور اس نے مضبوط دامن کو تھاما ہے۔

اسلام میں ایمان، انکار کے بغیر مکمل نہیں ہے بلکہ ہمیشہ خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ سرکشی کے مظاہر کا انکار کرنا چاہیے تاکہ ایمان مکمل ہو جائے۔

جمع کا صیغہ

عملی توحید اور انسان کے " ہونے " کے اس مرحلہ پر جو دلچسپ نکتہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ " نَعْبُدُ " کے لفظ میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور واحد کی صورت یعنی " اعبد " کا استعمال نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہا گیا کہ :

" میں صرف تیری پرستش کرتا ہوں۔"

بلکہ کہا گیا ہے کہ :

" ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں "

انسان سازی کے اس مرحلے پر اس نکتے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تعمیر معرفت خدا اور اس پر توجہ کے پرتو میں ہوتی ہے اور اس سے غفلت کی صورت میں نہیں ہوتی وہ عمل سے بنتا ہے محض فکر و نظر سے نہیں ۔ انسان اجتماعی عمل میں توحیدی معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ہی بنتا ہے اس سے الگ رہ کر نہیں ۔

انسان ایک فکری، الٰہی، عملی اور اجتماعی مخلوق ہے ۔ فکر اور معرفت کے بغیر انسان حقیقی انسان نہیں ہے ۔ خدا سے کٹا ہوا اور خدا سے غافل انسان' انسان نہیں ہے ۔ محض خدا کے بارے میں سوچنے والا اور عمل میں اس سے دُور شخص بھی حقیقی انسان نہیں ہے ۔ توحیدی معاشرے سے کٹا ہوا انسان بھی ناقص ہے ۔

پس حقیقت میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا مطلب یہ ہے :

" اے خدا ہم توحیدی معاشرے کے لوگ اپنے سفر میں ہم آہنگ ہو کر تیری طرف آرہے ہیں اور تیرے حکم کے مطیع ہیں "

" اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "

" صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تیرے علاوہ کسی سے مدد نہیں مانگتے اور استعانت نہیں چاہتے "

اس جملے میں استعانت اور مدد کے معاملے میں توحید کا مسئلہ سمویا گیا ہے ۔ یعنی صرف اسی (خدا) سے مدد طلب کرنا، صرف اسی سے استمداد کرنا اور صرف اسی پر اعتماد کرنا ۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو جسے دو طرح سے پیش کیا جا سکتا ہے ۔ ایک استمداد

اور استعانت کے اصول کے نقطۂ نظر سے۔ یعنی جو نظریہ علمار تعلیم و تربیت اور علمار اخلاق کا ہے اور وہ یہ کہ انسان کو خود پر اعتماد ہونا چاہیے۔ کسی دوسرے پر اعتماد کرنا اور اس سے مدد چاہنا انسان کو کمزور اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی مخلوق بنا دیتا ہے جب کہ خود پر اعتماد کرنا انسانی قوتوں کو بیدار اور زندہ رکھتا ہے۔

اس اصول کے مطابق دوسروں کی بجائے خود پر اعتماد کرنا چاہیے اور وہ دوسرا چاہے خدا ہو چاہے غیر خدا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دانشور "توکل" جو کہ خدا پر اعتماد کرنے کا دوسرا نام ہے اور اپنے آپ پر اعتماد کو سلب کرنے کا سبب بنتا ہے کی نفی کرتے ہیں اور اسے غیر اخلاقی قرار دیتے ہیں۔

اس سوال کی دوسری ممکنہ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کیوں غیر خدا سے مدد طلب نہیں کرنا چاہیے۔ غیر خدا کی عبادت نہ کرنا تو منطقی بات ہے لیکن غیر خدا سے مدد طلب نہ کرنے میں کیا منطق کارفرما ہے۔ خدا نے تو عالم کو عالم اسباب قرار دیا ہے اور ہم انسانوں کو دوسرے انسانوں اور دوسری اشیار کا ضرورت مند بنایا ہے اور ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم زندگی میں اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دوسری اشیار اور دوسرے لوگوں سے مدد طلب کریں۔

اس سوال کے جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اصل بات اور ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ غیر سے ہر قسم کی مدد طلب کرنا اور اس پر اعتماد کرنا بُرا فعل ہے بلکہ خدا نے اصولی طور پر انسان کو دوسروں کی محتاج مخلوق بنایا ہے۔ یعنی انسانی معاشرہ اس قسم کا ہے کہ ہر کوئی دوسرے کا محتاج ہے۔ اسلامی اوامر میں باہمی تعاون کا جو درس دیا جاتا ہے وہ اسی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے:

قرآن مجید میں ہے:

" تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى "۔

"نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔"

(سورہ مائدہ آیت ۲)

"تعاون" کا مادہ "عون" ہے۔ اگر غیر سے استعانت کسی مقام پر جائز نہ ہوتی تو پروردگار تعاون کا حکم نہ دیتا۔ اس آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک دوسرے کے محتاج ہیں لہٰذا ایک دوسرے کی مدد کیا کریں۔

ایک شخص حضرت علیؑ کے سامنے اس قسم کی دعا مانگ رہا تھا:

"اے خدا مجھے اپنی مخلوق کا محتاج نہ کرنا۔"

حضرت نے فرمایا:

"آئندہ ایسا مت کہنا۔"

اس نے عرض کیا:

"تو کیا کہوں؟"

فرمایا:

"کہو اے خدا مجھے اُس (اشرار) مخلوق کا محتاج نہ کرنا۔"

مطلب یہ ہے کہ پہلا جملہ ناممکن کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ انسانی تخلیق ہی اس طریقے پر ہوئی ہے کہ وہ اپنی دنیاوی زندگی کی پیش رفت میں دوسروں کا ضرورتمند ہے پس اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں یہ نہیں کہا گیا کہ انسان کو دوسروں سے مدد طلب نہیں کرنی چاہیے۔

تو پھر کیا کہا گیا ہے؟

اس آیت شریفہ سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ انسان کا آخری اعتماد اور قلب کا سہارا، یعنی وہ ذات جس پر انسان کا فی الواقع تکیہ ہے خدا ہونا چاہیے

اور دنیا میں جن چیزوں سے مدد طلب کی جاتی ہے انھیں محض وسیلہ سمجھے اور جان لے کہ خودِ انسان، اس کی جسمانی طاقت، زورِ بازو اور ذہنی قوت سب اور سب وہ وسائل ہیں جو خدا نے پیدا کیے اور انسان کے قبضہ اور اختیار میں دیے۔ ان کی ڈور انسان کے ہاتھ میں ہے۔

انسان دنیا میں اسباب و وسائل پر کس قدر اعتماد کرتا ہے لیکن بعد میں دیکھتا ہے کہ (اس کی توقع کے برعکس) وہ وسیلہ جو مدد کر سکتا تھا ویسی مدد نہیں کر سکا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنی قوتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے لیکن ہم کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بھی خلاف ورزی کر رہی ہیں۔ لیکن وہ واحد طاقت جس پر اگر انسان اعتماد کرے اور اپنی منصوبہ بندی اس کے ساتھ کرے تو اسے کوئی فکر دامن گیر نہ ہوگی "خدا" ہے۔

لکھتے ہیں کہ کسی جنگ میں رسول اکرمؐ لشکر سے الگ ہو کر لشکرگاہ کی حدود ہی میں واقع ایک ٹیلے پر آرام کرنے لگے اور سو گئے۔ اتفاق سے دشمن کی فوج کا ایک بہادر مسلح شخص گشت کرتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اس کی نظر رسول اللہؐ پر پڑی تو انھیں پہچان لیا اور بہت خوش ہوا کہ انھیں اکیلا پایا ہے اور ابھی انھیں مار ڈالے گا۔ رسول اللہؐ سو رہے تھے وہ شخص ان کے سر پر پہنچ گیا اور کہا:

"محمدؐ! یہ تم ہو؟"

حضرتؐ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"ہاں۔ میں ہوں۔"

اس شخص نے کہا:

"اب کون ہے جو آپؐ کو مجھ سے بچا سکتا ہے؟"

رسول اللہؐ نے بلا تذبذب فرمایا:

"خدا۔"

وہ شخص جسے ایسی توقع نہیں تھی کہنے لگا:

"ابھی پتہ چل جائے گا۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹا تاکہ پوری قوت کے ساتھ وار کرسکے کہ اچانک اس کا پاؤں پتھر سے ٹکرایا اور وہ زمین پر گر گیا۔

حضرتؐ جلدی سے اُٹھے اور اس کے سر پہ کھڑے ہو کر بولے:

"اب تمھیں مجھ سے کون بچا سکے گا؟"

وہ شخص چالاکی سے بولا:

"آپ کا کرم۔"

اور رسول اللہ نے اسے معاف کر دیا۔

غرض یہ کہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ انسان دنیا میں کسی وسیلے سے مدد طلب نہ کرے بلکہ یہ ہے کہ استمداد کے وقت مسبب الاسباب کو بھی پہچانے اور جان لے کہ اس کے وسائل اور اسباب کی ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے۔

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ"

"اے خدا ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔"

صراط مستقیم کیا ہے؟ اس کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

(۱) ـــــ سب موجودات ایک تکوینی اور غیر اختیاری راستے پر چل رہی ہیں جو کہ خدا کی طرف سفر میں ناموس ہستی کا لازمہ ہے۔

"اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ۔"

"سب کام خدا کی طرف رجوع ہوں گے۔"

(سورۃ شوریٰ آیت ۵۳)

"اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔"

"یہ کہ تمہارے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے۔"

(سورہ نجم آیت ۴۲)

"یَاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ۔"

"اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جارہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔"

(سورہ الانشقاق آیت ۶)

(۲) —— صراطِ مستقیم مختلف راستوں کے درمیان ایک سیدھا اور اعلیٰ راستہ ہے۔ راہ سعادت اور اختیاری راستہ ہے یعنی وہ راستہ جو انسان کو منتخب کرنا چاہیے۔

(۳) —— اس دلیل کے مطابق کہ انسان جو چیز منتخب کرتا ہے وہ راستہ (قسم کی) ہے پس انسان ایک مقصد کے لیے سفر اور راستے کی نوعیت کا انتخاب کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے کمال کی طرف جانا چاہتا ہے۔ پس انسان ایک تکمیل پانے والی مخلوق ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہمیں تکمیل کے راہ راست پر چلا۔

(۴) —— تکمیل کا راستہ ایسا نہیں ہے کہ اسے ہنوز ایجاد نہیں کیا گیا بلکہ محض اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ مکتب خود پرستی کا دعویٰ ہے کہ کسی (خارجی) راستے اور مقصد کا وجود نہیں انسان اپنے لیے اپنا مقصد اور اہمیت خود پیدا کرتا ہے اور راستہ بناتا ہے۔ یعنی انسان مقصد پیدا کرنے والا، راستہ

تراشنے والا، کمال پیدا کرنے والا ہے۔ یعنی کمال کے باکمال ہونے اور اپنی اہمیت کے اہم ہونے کا خلاق ہے۔ لیکن قرآنی نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد، راستہ اور مقصد کا مکمل ہونا اور اہمیت کا اہم ہونا کائنات کی تخلیق میں تعین ہو چکا ہے۔ اب انسان کو صرف اسے تلاش کرنا ہے، اس مقصد کو ڈھونڈنا ہے اور راستہ طے کرنا ہے۔

(۵) —— صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جس کی سمت ابتدا ہی سے معلوم ہے اس کے برعکس غیر مستقیم راستے وہ ہیں جو ٹیڑھے ہوں۔ ان میں بل اور خم ہوں یا وہ راستے جو آخر کار انسان کو مقصد تک تو پہنچاتے ہیں لیکن ان پر چلتے ہوئے بار بار سمت بدلنی پڑتی ہے۔ پس وہ راستہ جس پر چل کر انسان تکمیل کی منزل طے کرتا ہے متضاد راستوں پر چلنے سے مختلف ہے جیسا کہ عام طور پر ڈیالکٹک مکتب کے لوگ کہتے ہیں۔

(۶) —— تکمیل کے راستے کو ہنوز ایجاد نہیں بلکہ تلاش کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ مکانی راستوں کی طرح پہلے ہی سے راستہ چلنے والوں کے وجود سے باہر کوئی راستہ بنا دیا گیا ہے اور اب اسے اس پر محض قدم رکھنا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ راستہ چلنے والے کے وجود میں ایک ایسا راستہ ہے جو کمالِ حقیقی کی طرف لے جاتا ہے اور یہ کمال بارگاہ حق تک پہنچنے کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے وجود میں کمالِ حقیقی تک پہنچنے کے لیے فطری استعداد موجود ہے جیسا کہ کھجور کی گٹھلی یا

درخت بننے کی استعداد پائی جاتی ہے۔

(۷) ——— انسان فطری استعداد رکھتے ہوئے بھی کسی راہبر اور ہادی کا محتاج ہے کیونکہ انسان اور ان تمام مخلوقات کے درمیان ایک بنیادی فرق موجود ہے جو اپنے کمالات کے لیے طبیعی صلاحیت رکھتی ہیں اور وہ فرق یہ ہے کہ فطرت میں تمام مخلوقات کا راستہ واضح ہے اور کسی مخلوق کا ایک سے زیادہ راستہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن انسان ایسا نہیں ہے جدید فلسفے کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے:

"ہر مخلوق طبیعت کی حامل ہے لیکن انسان طبیعت سے خالی ہے۔"

مکتب خود پرستی کے پیروکار اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انسان ایک بے ماہیت اور بے طبیعت مخلوق ہے۔ مگر ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح وہ کہتے ہیں۔

انسان متضاد اور مختلف طبیعتوں کا حامل ہے اور اسے علوی اور سفلی طبیعتوں کے درمیان سے اپنا راستہ منتخب کرنا ہوتا ہے۔ حیوانات پر یہ انتخاب لازم نہیں ہے بلکہ گدھا، گھوڑا، بھیڑ، بکری، بلی، کتا..... سب کو ایسی جبلی خواہشات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے کہ ان خواہشات نے ان کا راستہ واضح کر دیا ہے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر ان کی اپنی مخصوص خُو اور خصلت چلی آ رہی ہے اور اپنی اپنی نسل میں سب کا رویہ ایک جیسا ہے، شہد کی مکھیاں اور چیونٹیاں گھر بنانے اور خوراک جمع کرنے میں یکساں ہیں اور ان کے کام میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی جاتی۔

لیکن انسان کے سامنے سینکڑوں راستے رکھے گئے ہیں جن میں سے کسی

کا بھی انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

سورہ واللیل میں فرمایا گیا ہے:

"اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی"

اے بنی آدم تمھاری کوششیں مختلف اور متفرق ہیں۔

بے شک یہ بات انسانی کمال کی ترجمان ہے۔ اس کی کمزوری کی نہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بات کیا اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم انسان کو مکمل طور پر بے راہ قرار دیں؟

مادہ پرست بالخصوص خود پرست تو یہی سمجھتے ہیں لیکن قرآن اس نظریے کو قبول نہیں کرتا۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان سے خدا تک کا راستہ بن چکا ہے اور وہ راستہ کمال انسان ہے۔ انسان کے سامنے مثال کے طور پر ہزار راستے رکھے گئے ہیں جن میں سے ایک صراط مستقیم ہے۔ یعنی یہ وہی شاہراہ ہے جو خدا کی طرف جاتی ہے اور خدا پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن انسان ان راستوں کے انتخاب میں خودمختار ہے اور اگر اس صراط مستقیم کو چن لے تو ٹھیک ورنہ باقی سب راستے غلط ہیں۔

ایک دن رسول اکرمؐ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرتؐ نے زمین پر کچھ لکیریں کھینچیں۔ ان میں سے ایک لکیر سیدھی تھی اور باقی سب ٹیڑھی پھر فرمایا:

"یہ ایک راستہ میرا راستہ ہے، باقی میرے راستے نہیں ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی ظلمت کا ذکر ہے وہاں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے لیکن نور کا ذکر واحد کے صیغے میں ہوا ہے۔

"اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ" (بقرہ ۲۵۷)

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار
اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں
نکال لاتا ہے۔"

اس مقام پر انبیاء کی طرف سے رشد و ہدایت کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ صراطِ مستقیم جو انسان کو آخری کمال تک پہنچاتا ہے اسے وہ انبیاء کی ہدایت کے بغیر نہیں پہچان سکتا۔ بلکہ خدا کے رسولوں کو انسان کا راہ نما ہونا چاہیے۔

تفسیر المیزان میں ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن میں لفظ سبیل بھی راستے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے لیکن اس کا معنی "صراط" سے مختلف ہے نیز سبیل جمع کے صیغے میں استعمال ہوا ہے لیکن صراط ہمیشہ واحد کے صیغے میں آیا ہے "سبیل" کا مطلب وہ ذیلی راستے ہیں جو اصل راستے کی طرف جاتے ہیں اور "صراط" کا مطلب اصلی راستہ ہے۔

ممکن ہے کسی مقام تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی اصلی راستہ ہو لیکن ذیلی راستے بھی ہوں جو آس پاس سے آتے ہیں اور متعدد ہیں لیکن آخر کار اسی اصلی راستے پر ختم ہوتے ہیں۔

ہم سب انسان ایک کاروان کی طرح ہیں جو کمال کی منزل طے کرنے کے لیے چل رہا ہے لیکن آخری راستے تک پہنچنے کے لیے ہمیں اصلی شاہراہ پر چلنا ہو گا۔ تاہم ممکن ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے ذیلی راستے پر چلتا ہوا اصلی راستے تک آپہنچے۔ اگر ہر کوئی اپنے اپنے مقام اور منصب پر اپنے انسانی، اخلاقی اور شرعی فرائض انجام دے تو حقیقت میں اس نے ایسا راستہ منتخب کیا ہے جو آخر کار اسے اصلی راستے تک پہنچاتا ہے۔ اگرچہ شروع میں راستے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مثلاً ایک طبیب ہے تو دوسرا محنت کش اور تیسرا تاجر .... یہ سب

ذیلی راستے ہیں جنھیں طے کرکے انسان خود کو صراطِ مستقیم تک پہنچاتا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ
وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

اس نقطۂ نظر سے کہ انسانوں کو مقام بندگی میں رہ کر کیا چیز حاصل کرنی چاہیئے اور راستہ منتخب کرتے وقت کونسا راستہ منتخب کرنا چاہیئے۔ وہ (انسان) تین طبقوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

پہلا طبقہ

یہ وہ انسان ہیں جو راہِ بندگی طے کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے لفظ "الرَّحِیم" کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایسے لوگوں پر پروردگار کی خاص رحمت ہوتی ہے اور خدا کا انعام مسلسل ان کے شاملِ حال ہوتا ہے گویا وہ محسوس کرتے ہیں کہ غیب سے کوئی ہاتھ ان کے اوپر ہے۔ یہی طبقہ درگاہِ الٰہی کا مقرب ہے۔ جس میں پہلے درجہ پر انبیاء اور بعد میں کامل انسانوں کی جماعت شامل ہے۔ باقی انسانیت کو ہمیشہ انہی لوگوں کو قائد بنانا چاہیئے اور ان کے پیچھے چلنا چاہیئے۔ مذکورہ آیت کے پہلے حصے میں انسان خدا سے ایسے ہی لوگوں کا راستہ طلب کر رہا ہے۔

دوسرا طبقہ

یہ پہلے طبقے کے مقابلے پر ہے اور یہ لوگ خدا کے بجائے غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں اور انھوں نے خدا سے سرکشی کی ہوئی ہے۔ ان کے اعمال کے اثرات بھی یکے بعد دیگرے ان کے وجود میں ظاہر ہوتے ہیں اور پہلے طبقے کے برعکس کوئی

اتھ انھیں بھی ہمیشہ راہ راست سے دور تر لیے جا رہا ہے اور یہ لوگ خدا کی طرف جانے اور پروردگار کی مسلسل نعمتیں حاصل کرنے کی بجائے خدا کے غضب کا شکار ہوتے ہیں اور راہِ کمال سے مکمل طور پر بھٹکے ہوئے ہیں اور شقاوت کی ہولناک وادی میں جا گرتے ہیں۔

"وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى"

(سورہ طٰہٰ آیت ۸۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو راہِ انسانیت پر چلنے کی بجائے حیوانی راستے پر چلتے ہیں۔ ان کی انسانیت مسخ ہو چکی ہے اور یہ آگے چلنے کی بجائے پیچھے کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ قرآن ایسے لوگوں کو "المغضوبِ علیھم" کہتا ہے۔

تیسرا طبقہ

ایک تیسرا طبقہ بھی ہے:

"مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ"

(سورۃ النساء آیت ۱۴۳)

ان لوگوں کے پاس کوئی معین راستہ نہیں ہے، وہ حیران و سرگرداں ہیں ہر لمحے جس راستے پر چلتے ہیں کسی مقام پر نہیں پہنچتے۔ قرآن انھیں "الضالین" کہتا ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ؕ

تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ:

"اے خدا ہمیں اپنا سیدھا راستہ دکھا۔ وہ راستہ جو تیرے اولیاء اور تیری درگاہ کے راستہ اور پاک لوگوں کا ہے۔ وہ لوگ جو ہمیشہ اور مسلسل تیری نعمتوں سے بہرہ ور ہیں نہ کہ وہ لوگ جو مسخ ہو چکے ہیں اور انسانیت کی حدود سے نکل چکے ہیں اور ان پر تیرا غضب ہوتا ہے اور نہ ان لوگوں کے راستے پر چلا جو حیران و سرگرداں ہیں اور ہر لمحے مختلف صورت اختیار کر کے کسی دوسرے گروہ کے ساتھ جا ملتے ہیں۔

امیرالمومنین
حضرت علی ابن ابی طالب
علیہ السلام نے فرمایا:

- خدا نے اپنے نبیؐ کو قرآن کے ساتھ بھیجا تاکہ لوگوں کو شیطان کی پرستش سے اللہ کی پرستش کی طرف دعوت دیں۔
- جان لو کہ قرآن کی تعلیمات کے بعد کسی اور لائحۂ عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔
- قرآن ایسی عزت و سربلندی ہے کہ اس کے حامیوں کو ناکامی نہیں ہوگی، ایسا حق ہے کہ جس کے مددگار ذلیل نہیں ہوں گے۔

بقرۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ
هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ
هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

سورۃ کی وجہ تسمیہ

یہ قرآن مجید کی سب سے لمبی سورہ ہے اور قرآن کے تقریباً اڑھائی پاروں پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس سورہ میں بنی اسرائیل کی بقرہ (گائے) کا ذکر ہے اس لیے اس کا نام سورہ بقرہ ہے۔

حروف مقطعہ

یہ مدنی سورہ ہے اور قرآن کی دیگر تیرہ ۱۳ سورتوں کی طرح اس کی ابتدا بھی مقطعہ حروف سے ہوئی ہے۔ حروف مقطعہ یعنی وہ حروف تہجی جو باہم مرکب نہ ہوں۔

اس قسم کی سورتیں کبھی ایک حرف سے شروع ہوتی ہیں مثلاً سورۂ ن والقلم یا ق اور بعض دو حروف سے مثلاً یٰس، طٰہٰ، طٰس اور کبھی تین حروف سے جیسے طسم، یا الم اور بعض چار حروف سے مثلاً المر اور بعض پانچ حروف سے جیسے حمعسق یا کھیعص۔

یہ خصوصیت صرف قرآن ہی کی ہے کسی دوسری آسمانی یا غیر آسمانی کتاب میں ہم نے کسی باب یا فصل کو مقطعہ حروف سے شروع ہوتے نہیں دیکھا۔

ان حروف سے مراد کیا ہے؟

یہ سوال صدرِ اسلام سے چلا آ رہا ہے اور اس بارے میں متعدد نظریات کا اظہار کیا گیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک کوئی قطعی رائے سامنے نہیں آئی۔

ہم یہاں بعض آرا نقل کرتے ہیں:

○ —— بعض کہتے ہیں کہ یہ کہنے اور سننے والے یعنی خدا اور رسولؐ کے درمیان ایک سلسلہ رموز و اسرار ہے۔ یہ ایسے مضامین و معارف تھے جو عام لوگوں کی فکری سطح سے بلند تر رکھے گئے اور چونکہ عوام انھیں سننے کی ہمت نہیں رکھتے لہذا واضح طور پر بیان نہیں کیے گئے۔ اور بطور رمز و کنایہ کہے سنے گئے۔ یہ بات دو عام انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جب ایک شخص

چاہتا ہے کہ اس کی بات کا سب کو علم نہ ہو تو وہ اپنے
مخاطب شخص سے کوڈ یا مخفف الفاظ میں بات کرتا ہے

○ — دوسری رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کے نام یا سورتوں کے نام ہیں جو ان کی ابتدا میں مذکور ہوئے ہیں۔ یعنی سورۃ بقرہ جس کے شروع میں الـمٓ ہے اس کا نام الـمٓ ہے اور سورہ طٰہٰ کا نام طٰہٰ ہے۔

○ — تیسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ قسمیں ہیں۔ قرآن میں جس طرح دوسرے مظاہر تخلیق یعنی سورج، چاند، ستاروں، دن، رات، نفس انسانی کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اسی طرح حروف تہجی کی بھی قسم کھائی گئی ہے پس الف۔ لام۔ م کا مطلب الف۔ لام۔ میم کی قسم ہے۔

انسان جب کسی چیز کی قسم کھانا چاہتا ہے تو حقیقت میں کسی ایسی چیز کی قسم کھاتا ہے جو اس کے لیے قابل احترام ہو اور مخاطب کو بھی معلوم ہو کہ وہ چیز اس کی پسندیدہ ہے اور وہ اس کو ذلیل و خوار کرنے پر تیار نہیں۔ ایسی چیز اس کی بات کا تکیہ اور صحت قرار پاتی ہے۔ لہٰذا علمائے ادب کہتے ہیں کہ قسم حق بات کی سچائی کی تائید اور تاکید ہوتی ہے۔ کبھی انسان اس کی بجائے صرف کسی بات کے فائدے کے لیے جو کہ قسم کا لازمہ ہے، قسم کھاتا ہے۔ یعنی اس لیے کہ مخاطب یہ خیال کرے کہ قسم کھانے والا فلاں چیز کا احترام کرتا ہے۔ جب کوئی شخص لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ میں فلاں آدمی کا احترام کرتا ہوں تو وہ اس کے سر اور جان کی قسم کھاتا ہے۔ ایسی صورت میں مقصد صرف اس چیز کی اہمیت بیان کرنا ہوتا ہے جس کی قسم کھائی جاتی ہے نہ کہ اس بات کی جس کے لیے قسم

کھائی گئی ہے۔

قرآنی قسموں کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔ قرآن اگر سورج، چاند، زیتون، انجیر اور لیل و نہار کی قسم کھاتا ہے تو وہ انسان کو ان چیزوں کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن میں جس ایک چیز کا بنیادی کردار رہا ہے وہ حروفِ تہجی ہیں۔ یہ حروف اور اصوات جو حروف کی صورت میں خارج ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

حیوانات کی بھی آواز ہے لیکن وہ اس آواز سے "حروف" نہیں بنا سکتے ___ اگر انسان بھی آوازوں کو "حروف" میں تبدیل نہ کر سکتا (گونگے آدمیوں کی طرح) تو اسے قوتِ گویائی حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی وہ اپنے مقاصد دوسروں کے سامنے پیش کر سکتا۔ نہ علم و تہذیب اور صنعت قائم ہوتی۔ حتیٰ کہ لکھنا جو ایک عظیم نعمت ہے اور قرآن میں اس کی قسم کھائی گئی ہے۔ بولنے کے مرحلے کے بعد سامنے آیا ہے۔ یعنی اب ہم اگر الف، لام، دال، جیم کو الگ الگ لکھ سکتے ہیں تو اس لیے ہے کہ ہم ان حروف کا الگ الگ تلفظ کر سکتے ہیں اگر یہ حروف نہ ہوتے تو ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اس کی شکلیں بنانا پڑتیں مثلاً گھر کی شکل سمجھانے کے لیے ہم گھر کی شکل بناتے اور گاڑی کا مطلب سمجھانے کے لیے اس کی تصویر۔

لیکن یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سب چیزوں کی شکلیں نہیں ہوتی ہیں کہ ان کی ترسیم کر کے مطلب سمجھایا جا سکے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ حروف قرآن کے معجزہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یعنی -

عربی زبان میں حروفِ تہجی کی مجموعی تعداد ۲۸ ہے اور بعض زبانوں میں زیادہ . بلکہ ہم نے سُنا ہے کہ کچھ زبانوں کے حروفِ تہجی کی تعداد تقریباً تین سو ہے . بہرحال حروفِ تہجی بات کے تانے بانے کا بنیادی عنصر ہیں اور یہ عنصر سب کے پاس ہے . لیکن کیا سب بہترین بات کہہ سکتے ہیں ؟ نہیں ،

ٹھیک ہے - یہ حروف بالکل تار و پود کی طرح ہیں جو سب جولاہوں کے پاس ہے لیکن ڈیزائن کے لحاظ سے کیا سب جولاہوں نے ایک جیسا کپڑا بُنا ہے ؟ نہیں -

سخن و منطق کا تمام ہنر اور قوت انہی مرکب حروف کی مرہون ہے کتابیں مقالات ، قصائد ، غزلیں سب انہی حروف سے تیار کیے گئے ہیں . حالانکہ معیار کے لحاظ سے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے .

آگے چل کر ہم یہ آیت پڑھیں گے کہ قرآن لوگوں کو دعوت مبارزت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم سخن و کلام کے تمام ماہرین کو اکٹھا کرلو پھر دیکھو کیا تم قرآن کی مثال پیش کرسکتے ہو ؟

قرآن حروفِ تہجی کے نمونے کے طور پر ان حروف کا ذکر کرکے حقیقت میں قرآنی آیات کا خمیر پیش کرنا چاہتا ہے اور بتانا چاہتا ہے کہ اے لوگو ! قرآن کسی دوسرے مواد سے تیار نہیں کیا گیا کہ آپ کہہ سکیں اگر یہ ہمارے پاس ہوتا تو ہم بھی قرآن کی نظیر لا سکتے .

یہی حروف ہیں جو بدیعی طریقے سے تالیف ہوئے ہیں اور جوڑے گئے ہیں . آپ بھی آئیں اور ان حروف سے قرآن کی نظیر پیش کریں .

یہ کسی کارخانے کی پیداوار نہیں کہ آپ کہہ سکیں . اس کے کل پرزے ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ یہاں تو کل پُرزے بھی آپ کے ہاتھ میں ہیں اور

خام مال بھی ۔ یہ بات قرآن کے عظیم معجزے کی ترجمان ہے کہ ایک اُمّی شخص کے ذریعے ایسا کلام پیش کیا گیا جس کی مثال کوئی شخص پیش نہیں کرسکتا۔

چند سال پہلے قرآن کے حروفِ مقطعہ موضوعِ سخن بلکہ موضوعِ خبر بنے رہے۔ ہوا یوں کہ کمپیوٹر کے ماہر ایک مصری نے قرآن کی ان چودہ سورتوں کے بارے میں گہرا حساب کتاب لگایا جو حروفِ مقطعہ سے شروع ہوتی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سورتوں میں وہ حروف زیادہ استعمال ہوئے ہیں جو حروفِ مقطعہ میں آئے ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ میں الف، لام، میم دوسرے حروف کی نسبت زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ تناسب اس قدر گہرا ہے کہ انسانی دماغ اس کا حساب نہیں لگاسکتا۔ کیونکہ بعض اوقات معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ کمپیوٹر کے علاوہ کسی دوسری چیز سے حساب نہیں لگایا جاسکتا۔

بحث کے خاتمے پر میں ایک دوسرا قیاس ظاہر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ:

قدیم زمانے سے لے کر اب تک یہ بحث چلی آرہی ہے کہ نظامِ ہستی پہلے کیسا تھا؟

یعنی مقدم کیا ہے اور مؤخر کیا؟

اس سوال کے جواب میں مجموعی طور پر دو نظریات سامنے آئے۔

کچھ کہتے ہیں کہ پہلے بات تھی۔ یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے فکر و فہم تھا کیونکہ بات فکر کی ترجمان ہے۔ مادہ اس کے بعد پیدا ہوا۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مادہ پہلے تھا۔ بعض مادے کی فوقیت کے قائل لوگوں کا کہنا ہے کہ پہلے مادہ اور طبیعت (NATURE) پیدا ہوئے اور مادہ کی تکمیل کے بعد بتدریج فہم وشعور اور ادراک پیدا ہوا۔ اس کے بعد بات وجود میں آئی۔

ان دو نظریات میں سے گویا قرآن نے پہلا نظریہ قبول کیا ہے۔ کیونکہ جب قرآن تخلیق کائنات کی داستان سنانا چاہتا ہے۔ تو کہتا ہے:

"اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ"

"اس کا حکم ایسا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے جوں ہی وہ کہتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتا ہے۔"

یعنی پہلے قول ہے پھر دوسری تخلیقات۔ لیکن یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ قول یہاں صرف ایک لفظ کے معنی اور آواز کے مفہوم میں نہیں بلکہ اس کا ایک جامع تر اور مکمل تر مفہوم ہے۔

ہمارے خیال میں خدا حروفِ مقطعہ سے اپنے کام کے آغاز کا سلیقہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یعنی قول اور سخن و فکر کو مادہ، جسم اور طبیعت پر فوقیت حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ حروف مقطعہ متشابہات قرآن میں سے ہیں اور بالخصوص اگر ہم اول الذکر نظریے کو قبول کرلیں تو یہ خدا اور رسولؐ کے درمیان رموز ہیں۔

"ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ"

"وہ کتاب"

غور فرمائیں۔ یہ نہیں کہا جا رہا کہ "یہ کتاب" بلکہ کہا جا رہا ہے: "وہ کتاب"۔ اور یہ بہت بڑا نکتہ ہے۔ کیونکہ یہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی چیز کا عظمت کے ساتھ نام لینا مقصود ہو تو اس کے لیے دُور کا صیغہ استعمال کرتے ہیں مثلاً اس طرح کہ اس چیز کا ہم سے اور آپ سے بہت فاصلہ ہے۔

"لَا رَيْبَ فِيْهِ"

"اس میں کوئی شک نہیں"

کیا مطلب؟ کس طرح قرآن میں شک نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے

کہ واقعی ایسے لوگ ہیں جو قرآن کی اصالت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ خود قرآن ہے جو اسی سورۃ میں آگے چل کر کہتا ہے:

"وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ"

(سورۃ بقرۃ۔ آیت ۲۳)

اگر تم کو شک ہو تو اس طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ۔

تم لوگ نہیں کہتے کہ تمہیں شک نہیں ہے۔

اس کا جواب یوں ہے کہ جب آپ ایک کتاب دیکھتے ہیں جس میں کوئی واقعہ درج ہے تو مطالعہ کے بعد اپنے تئیں غور و فکر کرتے ہیں کہ کیا یہ واقعات سچے ہیں یا ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ آپ کو تردد اور شک ہے۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے آپ کو چاہیے کہ ان ماخذ تک رسائی حاصل کریں جن کا ذکر اس واقعہ یا کتاب میں ہوا ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور اصولی طور پر خبروں، رپورٹوں اور دعووں میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے۔ ان کو ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن بعض اوقات کوئی بات انسان پر بالکل واضح اور محسوس طور پر ثابت ہو جاتی ہے اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ مثلاً کوئی ایسا شخص جسے آپ جانتے نہیں ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی کبھی نشست و برخاست نہیں رہی ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ عادل ہے تو اس مقام پر آپ کو شک گزرتا ہے۔ جسے رفع کرنے کے لیے آپ کو ثبوت اور دلیل چاہیے۔ دو عادل شخص جن کے عدل کا آپ کو پہلے ہی سے اعتراف ہے۔ وہ اگر اس مدعی شخص کے

عدل پر گواہی دے دیں تو بات مان لیں گے۔ ورنہ اس کا دعویٰ جھٹلا دیں گے۔

اسی طرح کوئی شخص جس سے آپ مانوس ہیں اور سفر و حضر اور کردار و رویہ میں اس کی شخصیت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ وہ اگر تقویٰ اور عدل کا دعویٰ کرے تو آپ اس کے اثبات کے لیے کوئی مزید دلیل طلب نہیں کریں گے۔

علمی اور نظریاتی مسائل میں بھی ایسا ہی ہے۔ بعض اوقات بعض مسائل کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات جب انسان پر مسئلہ کی اصلیت واضح ہو جائے تو اسے مزید دلیل کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس مسئلے کا خاکہ اس کے ثابت ہونے کے مساوی ہے

قرآن کے بارے میں بھی ایسا ہی ہے۔ ممکن ہے کسی کو قرآن کی اصالت میں شک ہو لیکن یہ شک اس وقت تک ہی ہوتا ہے جب کوئی قرآن سے دور رہے۔ جونہی کوئی قرآن کے قریب ہوا اس کا شک رفع ہو گیا۔

قرآن کے قریب ہونا دو طرح سے ہے:

- ○ ایک قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کی آیات کی تفسیر دیکھنا۔
- ○ دوسرا اس پر عمل کرنا۔

چونکہ قرآن صرف ایک نظریاتی کتاب نہیں اور اس میں عمل و نظر ساتھ ساتھ ہیں۔ لہٰذا مذکورہ آیت میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ:

"اے لوگو! جو قرآن میں شک رکھتے ہو اور اس میں حق بجانب بھی ہو کیونکہ تم نے نہ قرآن پر غور کیا نہ قریب سے اس کا مطالعہ کیا اور نہ میدانِ عمل میں اسے آزمایا۔ تم اگر قرآن کے قریب ہو جاؤ

اور اسے لمس کرو تو اس کی اصالت میں تمھیں کوئی
شک نہ رہے ۔"

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔"

قرآن مجید کی شناخت اور اس کے قریب ہونے میں اولین چیز یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ اصولی طور پر قرآن کس مقصد کے لیے نازل ہوا اور اس کی ماہیت کیا ہے؟ تاکہ اس کی اصالت میں ہمیں کوئی شک نہ ہو چونکہ جس کتاب کے بارے میں انسان کو خبر ہی نہ ہو کہ کس مقصد کے لیے لکھی گئی ہے وہ اس کے بارے میں کسی رائے کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا ہے اور کس مقصد کے لیے ہے؟

کیا طب کی کتاب ہے؟

فلسفہ ہے؟

تاریخ ہے؟

ریاضی ہے؟ .... نہیں نہیں۔

پھر کیا ہے؟

ہدایت کی کتاب ہے۔

یہ کس قسم کے لوگوں کی ہدایت کرتی ہے؟ کیا سب کو؟ یعنی کیا قرآن آنے کے بعد گمراہی باقی نہیں رہے گی اور سب جبری طور پہ ہدایت پالیں گے؟

نہیں!

یہ کتاب سب کو ہدایت نہیں کرتی بلکہ کچھ لوگ اس کے ذریعے گمراہ ہو جائیں گے جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۲۶ میں ہے:

"یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیراً"

"قرآن کے ذریعے بہت سے لوگ ہدایت پاتے ہیں
اور بہت سے گمراہ ہوتے ہیں۔"

لیکن شرط یہ ہے:

"وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ"

"یعنی قرآن کے ذریعے صرف فاسق لوگ ہی گمراہ
ہوں گے۔"

فاسق لوگ وہ ہیں جو انسانی فطرت کے راستے سے ہٹ جائیں۔

مولانا روم کہتے ہیں:

جب نکتے بہت گہرے اور لطیف ہوں تو ان سے
لائق افراد مزید اوپر آجاتے ہیں اور نالائق لوگ
گمراہ ہو جاتے ہیں۔

از خدا می خواہ تا زین نکتہ ہا
در نلغزی و رسی در منتہا

پھر اسی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

زانکہ از قرآن بسی گمرہ شوند
زین رسن قومی درون چہ شدند

"رسن" یعنی طناب اور رسّی۔ یہ لفظ بھی قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے۔ جہاں قرآن کو "حبل اللہ" کہا گیا ہے۔ یعنی قرآن خدا کی رسّی ہے۔

مر رسن را نیست جرمی ای عنود
چون ترا سودای سر بالا نبود

قرآن کی رسی سے کچھ لوگ کنوئیں میں گر پڑتے ہیں

حالانکہ رسّی تو رسّی ہے اس سے اوپر بھی چڑھا جا سکتا ہے اور نیچے بھی اُترا جا سکتا ہے۔ رسّی کا کوئی گناہ نہیں ہے۔

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ"

"یہ کتاب متقی اور پاک لوگوں کو ہدایت کرتی ہے۔"

متقین سے مراد وہی لوگ ہیں جو اپنی پہلی فطرت پر قائم رہے۔ فطرت کے بارے میں قرآنی نظریہ یہ ہے کہ ہر انسان پاک وصاف دنیا میں آتا ہے اور اس کی ذات میں تقویٰ ہوتا ہے لیکن ممکن ہے معاشرے کی آلودگیوں سے بتدریج وہ فطری راستے سے بھٹک جائے حتیٰ کہ مکمل طور پر مسخ ہو جائے۔

قرآن یہاں فرماتا ہے کہ اگر کوئی اپنی اوّلین فطرت پر موجود رہے تو یہ کتاب اسے منزل مقصود تک رہنمائی کرتی ہے اور اس کے وجود میں جو صلاحیتیں ہیں انھیں وہ فضیلت بخشتی ہے۔

"اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ"

قرآن کی پہلی ہدایت یہ ہے کہ انسان غیب پر ایمان رکھے۔ "غیب" اور "شہادت" دو قرآنی اصطلاحات ہیں۔

قرآنی نظریۂ کائنات کے مطابق عالم ہستی صرف وہی نہیں جسے ہم محسوس کرتے ہیں بلکہ محسوسات تو اس دنیا کا ایک مختصر سا حصہ ہیں۔ زیادہ حصہ تو ماورار میں ہے۔ جو چیز محسوس ہوتی ہے اس کا نام "شہادت" ہے اور جو غیر محسوس ہے اسے "غیب" کہتے ہیں۔

فلاسفہ جسے عالم فطرت کہتے ہیں یعنی درخت، پھول، دریا، صحرا، کہکشاں ستارے..... یعنی ہر وہ چیز جسے انسان دیکھتا ہے یا سونگھتا ہے یا سنتا ہے

یا مختصراً جسے محسوس کرتا ہے یا قرآن کے مطابق انسان اسے "شہود" کرتا ہے یہ سب سلسلہ "شہادت" سے متعلق ہیں۔

اگر دنیا صرف اسی حصہ تک محدود ہوتی تو اس وقت انسانی نظریہ کائنات ایک مخصوص نظریہ کائنات ہوتا۔ مثلاً ایک انسان جب یہ دیکھتا کہ ایک آدمی پیدا ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ اس دنیا میں رہتا ہے اس کے بعد مرجاتا ہے اور فنا ہوجاتا ہے تو وہ خیال کرتا کہ انسان یہی ہے اسے اس کی ابتدا اور انجام سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ بات اس کے خیال میں آتی کہ یہ انسان کہاں پیدا ہوا ہے اور کہاں جائے گا؟

لیکن قرآن مجید کی ذمہ داری یہ ہے کہ انسان کو اس تنگ نظری سے باہر نکالے اور اسے یہ شعور بخشے اور اس چیز پر اس کا ایمان قائم کرے کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے وہ تو کائنات کی ہلکی سی جھلک ہے۔ اس کے ماوراء میں ہستی کا ایک بے پایاں اور عظیم دریا بہہ رہا ہے۔

انسان کے لیے غیب کا بہترین نمونہ خود انسان کا وجود ہے۔ ہمارا بدن اور تن ہمیں محسوس ہوتا ہے اور ہم کو اپنی نفسیات کا بھی علم ہے۔ یہ دو چیزیں ہی ہمارے لیے "شہادت" ہیں لیکن دوسروں کے بارے میں ہمیں ایسا علم نہیں ہے۔ ان کی نفسیات ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ "غیب" ہے کیونکہ اگر ہم ساری زندگی بھی کسی کے ساتھ گزار دیں تو ہم صرف اپنے رفیق کی آواز سُن سکتے ہیں۔ اس کی رنگت دیکھ سکتے ہیں، اسے لمس کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے اندر کیا ہے؟ وہ ہم پر ہمیشہ مخفی ہے۔ اگر ہم اس کے دل کی باتوں سے آگاہ ہوتے ہیں تو یہ محض اس وجہ سے ہے کہ وہ ہم سے باتیں کرتا ہے۔ ورنہ ہم براہ راست طور پر کبھی اس کے دل کے اندر چھپی باتوں سے واقف نہ ہوسکے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ آج کل نفسیات میں ایک نکتہ یہ پیش کیا جارہا ہے کہ انسان کا ایک اور غیب بھی ہے جو خود اسے بھی معلوم نہیں۔ اس کا نام ماہرین نفسیات نے

"خود کی نامعلوم نفسیات" رکھا ہے۔

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ ایک نفسیات وہ ہے جس کا ہمیں علم ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ:

میں ایسے سوچتا ہوں،

میں یہ محسوس کرتا ہوں،

میں اس چیز کو پسند کرتا ہوں،

فلاں شخص کو ناپسند کرتا ہوں ....،

اس کے برعکس ایک نفسیات ایسی ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہے۔ حالانکہ وہ ہمارے وجود کا ایک بڑا حصّہ ہے۔ یہ انسان ہے جس کی زیادہ چیزیں چھپی ہوئی ہیں اور محض کچھ حصّہ ظاہر ہے۔

قرآن اس بات کو ساری دنیا کے بارے میں کہتا ہے اور انسان کو ایک نیا نظریۂ کائنات عطا کرتا ہے۔ ملائکہ، لوحِ محفوظ، عرش، کرسی یہ سب عالمِ غیب و باطن سے متعلق چیزیں ہیں۔ لیکن انھیں محض اس لیے نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ یہ ہمارے حواس سے پوشیدہ ہیں بلکہ ہمیں عقیدہ رکھنا چاہیے کہ کائنات کا ایک حصّہ چھپا ہوا ہے جسے ہمارے حواس محسوس کرنے سے عاجز ہیں۔ صرف ظاہر حصّہ ہم پر ظاہر ہے۔

"وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ"

غیب پر ایمان لانے کے بعد جو دوسرا اصول قرآن پیش کرتا ہے وہ نماز کا قائم کرنا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ پہلا اصول یعنی غیب پر ایمان ایک مسلمان کے فکری اور اعتقادی نظام سے متعلق ہے اور دوسرا اصول خود سازی اور تیسرا اصول یعنی انفاق جس پر ہم تھوڑی دیر بعد بحث کریں گے "معاشرہ سازی" سے

تعلق رکھتا ہے۔

یہاں نماز کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسے دین کا ایک ستون قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہر مکتب و دین افراد کی تعمیر کے لیے کوئی پروگرام پیش کرتا ہے تو اسلام کے تربیتی پروگرام میں سرفہرست عبادات ہیں اور عبادات میں سب سے اوپر نماز ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "نماز پڑھتے ہیں" بلکہ کہتا ہے "نماز قائم کرتے ہیں"۔

نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے میں فرق ہے۔ قرآن میں جن مقامات پر نماز پڑھنے کا مفہوم پیش کیا گیا ہے اصولی طور پر وہاں مذمت کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی وہاں ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی نماز قابل اعتراض تھی۔

نماز قائم کرنا کیا ہے؟

نماز قائم کرنے سے مراد نماز کا حق ادا کرنا ہے۔ یعنی نماز ایک بے روح پیکر کے طور پر ادا نہ کی جائے بلکہ ایسی نماز ہونی چاہیے جو واقعی بندے کو اپنے خالق کی طرف متوجہ کرے۔

سورۃ طٰہٰ آیت ۱۴ میں "ذکراللہ" کا مطلب یہی ہے

"اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ"

خدا کو یاد کرنا غیر خدا کو بھلانے کے برابر ہے۔ اگر انسان خواہ تھوڑی دیر کے لیے ہی خدا کے ساتھ راز و نیاز کرے اور اس سے مدد مانگے اور اس کی ثنا کہے اور اس کے اللہ ہونے، رب ہونے، رحمان ہونے، رحیم ہونے، احد ہونے صمد ہونے لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ

ہونے کی تعریف کرے تو یہ عمل اس کے اندر بہت اثر رکھتا ہے اور انسان کی روح ویسی بنتی ہے جیسے اسلام چاہتا ہے۔ خدا کی تعریف اور یاد کیے بغیر ایسا نہیں ہوسکتا۔

"وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ"

انفاق کیا ہے؟

وہ لوگ انفاق کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود کو تہی دست کرلیتے ہیں (جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے) بلکہ یہ لوگ اپنے ذخیرہ شدہ اموال کو خرچ کرتے ہیں اور ممکن ہے انفاق کا مطلب ازالہ ہو۔ یعنی غربت وافلاس کا ازالہ یہ عمل غربت کو ختم کرتا ہے۔

انفاق انسان کا معاشرے کے ساتھ رابطہ استوار کرتا ہے جیسا کہ پہلا اصول یعنی غیب پر ایمان انسان کے نظریۂ کائنات سے متعلق ہے اور دوسرا اصول یعنی نماز قائم کرنا انسان کے غیب کے ساتھ دائمی رابطے کا مظہر ہے۔

کیا انفاق صرف مال ہی سے ہوسکتا ہے؟

اس آیت میں کہا گیا ہے۔

"ہم نے ان کی جو روزی مقرر کی ہے وہ انفاق کرتے ہیں"۔

روزی کا وسیع مفہوم ہے۔ خود قرآن میں اس لفظ کا معنوی اور مادی روزیوں پر اطلاق ہوا ہے۔ دانائی اور دانش بھی خدا کی روزی ہے اور جن لوگوں کو خدا کی یہ دین حاصل ہے انھیں اس سے انفاق کرنا چاہیے اور دوسروں کو بھی اس سے بہرہ ور کرنا چاہیے۔

فلسفۂ انفاق

ممکن ہے بعض لوگ یہ گمان کریں کہ انفاق صرف سماجی خلا پُر ہونے کا نام ہے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ اگر اس مسئلے کو حکومت اپنے ذمے لے اور کمیٹیاں تشکیل دے کر غربت کے مسئلے کو حل کرے تو پھر اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ انفرادی طور پر بھی انفاق کیا جائے۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ یعنی انفاق کا تعلق محض خلا کے پُر ہونے سے نہیں بلکہ "تعمیر" سے ہے۔

انسان کے پاس کوئی چیز ہو اور وہ اسے اپنے سے الگ کرے اور خدا کی رحمانیت کا مظہر بنے تو یہ عمل انسان کی تعمیر میں بہت مؤثر ہے۔ "عطوفت" کا مادّہ "عطف" ہے۔ یعنی دوسروں کی طرف مائل ہونا اور ان کے دل کے ساتھ دل ملانا خود ایک مقصد ہے۔ اگر معاشرے میں ایسا بنیادی اور اہم مقصد نہ ہو تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک خاندان میں محبت اور عطوفت مفقود ہو جائے۔ اور اس کی بجائے گھر ایک بیشہ ورانہ کمیونٹی سنٹر بن جائے۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے پیروکار یہ کہتے ہیں کہ خاندانی زندگی کا فلسفہ کیا محض یہی نہیں کہ والدین بچوں کو پالیں اور حادثات سے بچائیں اور بیماری کے وقت ان کی تیمارداری کریں؟

بچوں کی اس قسم کی تربیت قدیم زمانے میں ہوا کرتی تھی لیکن اب معاشرے مکمل ہو چکے ہیں لہٰذا خاندان کے فرائض سرکار کے بڑے بڑے اداروں کو منتقل ہو جانے چاہئیں۔ بچے کو اپنی جائے ولادت سے سیدھا چلڈرن کیئر سینٹر میں چلے جانا چاہیے اور وہاں دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر بڑھنا پلنا چاہیے۔

اس طرح وہ ادارے یا مراکز والدین کی جگہ لے لیں گے اور وہ حقوق جو قدیم زمانوں میں والدین کے اولاد پر تھے اس کے برعکس والدین کے اولاد پر جو فرائض ہیں وہ سب قوم اور حکومت کے تعلقات کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس سارے فلسفے میں خرابی وہاں ہے جہاں انسانی فطرت کو ترک کیا جاتا ہے ماں باپ اپنے ممتا اور باپ کے جذبات کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں اور اولاد، اولاد کے جذبات کے ساتھ۔ یعنی ماں چونکہ ماں ہے لہٰذا اس کی فطرت ایسی ہے کہ وہ اپنے بچے کو اپنی محبت کی آغوش میں پالنا چاہتی ہے۔ وہ یہ عمل لاشعوری طور پر انجام دیتی ہے اور خود اسے پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟

دوسری طرف ماں اپنے بچے کو جس محبت کے ساتھ چومتی ہے اور اسے سینے کے ساتھ لگاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی پرورش بھی کر رہی ہوتی ہے۔ اس محبت و شفقت کی مثال بیٹری چارج کرنے جیسی ہے۔ یہ بیٹری چارج ہوتی رہے گی اور جب بچہ ان محبتوں میں بڑا ہو گا تو وہ روشنی دے گا۔ محبت کی نظر سے دوسروں کو دیکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو بچے والدین کی آغوش محبت سے باہر سرکاری پرورش گاہوں میں پلتے ہیں وہ اکثر اوقات خطرناک مجرم بن جاتے ہیں۔

انفاق بھی یہی ہے۔ اسے صرف ایک پہلو سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ انفاق صرف بھوکوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ لہٰذا یہ کام کسی دوسرے طریقے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ انفاق کا فلسفہ "انسان سازی" ہے کیونکہ انسان درگزر، بخشش، ایثار سے انسان بنتا ہے۔

اس بنا پر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قانع ہوں اور صرف پانی کے پیالے پر زندگی گزار لوں گا۔ اس کے علاوہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں اور میں ایک مکمل شخص ہوں۔ مکمل شخص وہ ہے جو اپنے پاس مال رکھتا ہو، مال کما سکتا ہو اور دوسروں کو

دے سکتا ہو۔ یعنی مال حاصل کرنا اور اسے اپنے سے الگ کرنا انسان بنانے کا عامل ہو۔
قرآن مجید سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہے جہاں رسول اللہؐ سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ:

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ"

(سورۃ توبہ۔ آیت ۱۰۳)

اس آیت میں صدقے کے اسی فلسفہ تعمیر انسان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نہ کہ سماجی فلسفے کا۔ یعنی حاجت مندوں کا شکم سیر ہونا۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے

"ان کے اموال سے صدقہ لو اور اس طرح آپ انہیں
پاک کرتے ہو اور ان کی نشوونما کرتے ہو۔"

اس کی مثال جڑی بوٹیاں تلف کرنے کی سی ہے جس سے پودا مزید اگتا ہے اور اصولی طور پر ہر زندہ عنصر کے لیے یہی فارمولا ہے کہ اس کی مشکلات دور کرنے سے اس کی بہتر نشوونما ہوتی ہے۔

"وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ"

متقی لوگوں کی ایک اور صفت وحی پر ایمان ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اس پر ایمان رکھتا ہو اور کوئی اس پر ایمان نہ رکھتا ہو یعنی اسے صرف دنیا کی بڑی کتابوں میں سے ایک کتاب مانتا ہو اور سمجھتا ہو کہ اس کتاب میں نجات دلانے والی تعلیمات ہیں لیکن ساتھ ہی اس کا یہ عقیدہ بھی ہو کہ یہ کلام الٰہی نہیں اور وحی کی صورت میں نازل نہیں ہوئی۔

شاید اکثر لوگ جو مسلمان نہیں ان کا ایسا ہی عقیدہ ہے۔ وہ جب تعلیم و تربیت کے لیے کتابوں کے نام گنواتے ہیں تو قرآن کو بھی اس میں شامل

کر لیتے ہیں۔

"در آغوشِ خوش بختی" نامی کتاب کے مصنف نے ایک باب میں مطالعہ پر زور دیتے ہوئے ترقی کے لیے جن عظیم کتابوں کا نام لیا ہے ان میں سے ایک قرآن ہے۔

عرب مادہ پرست شاعر شبلی شمیل نے رسول اللہؐ اور قرآن مجید کے بارے میں نہایت دلچسپ شعر کہے ہیں۔ وہ رشید رضا مصری کے نام اپنے اشعار میں کہتا ہے ؎

انی و ان اک قد کفرت بدینہ
هل اکفرن بمحکم الآیات

"میں اگرچہ اس (رسول اللہؐ) کے دین کا انکار کرتا ہوں۔ لیکن میں قرآن کی پختہ آیات کا کیسے انکار کر سکتا ہوں؟"

لیکن اس طرح بھی قرآن کو ماننا قرآن پر ایمان کے مصداق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قرآن پر ایمان یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ ہو کہ قرآن وحی ہے اور خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

"نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ○ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ○

(سورۃ شعراء آیات ۱۹۲، ۱۹۳)

یعنی اس کتاب کو ایسے پیغامات کا مجموعہ سمجھا جائے جو عالمِ غیب سے عالمِ شہادت کی طرف آئے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ایمان بالغیب میں وحی بھی شامل ہے چونکہ وحی کا مسئلہ

چند وجوہ کی بنا پر "خدا" کی طرح کے مسائل میں شامل نہیں لہٰذا یہاں اسے الگ اور دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔

"وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ"

"وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں"

"آخِرَة" جسے ہم اُردو میں آخرت لکھتے ہیں۔ آخر کی مونث ہے اور یہ لفظ "اوّل" کا متضاد ہے جس کی مونث "اولیٰ" ہے

قرآن میں "آخرة" کا مونث کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ عام طور پر دوسرے مقامات پر دوسرے الفاظ مثلاً "دار" یا "حیات" کے لیے صفت لائی جاتی رہی ہے اور چونکہ موصوف مؤنث تھا لہٰذا صفت کو موصوف کے اتباع میں مؤنث ہی استعمال کیا جاتا رہا۔

"آخرة" کبھی "دنیا" کے بالمقابل بھی استعمال ہوتی ہے اور کبھی "اولیٰ" کے بالمقابل۔ دنیا کا لفظ ممکن ہے "دنو" سے نکلا ہو جو قرب اور نزدیکی کے مفہوم میں ہے۔ یا ممکن ہے اس کا مأخذ "دنی" ہو جو پست کا مفہوم دیتا ہے۔ اگر یہ "دنو" سے ہو یعنی موجودہ زندگی جو کہ ہم سے زیادہ قریب ہے تو آخرت کا مطلب خود بخود وہ زندگی ہوگا جو ہم سے دور تر ہے اور اگر یہ "دنی" سے ہو تو اس کا مطلب یہ زندگی ہے جو پست ہے اس زندگی سے جو آخرت کے نام سے موسوم ہے اور ارفع ہے۔

لیکن سورۂ "والضحیٰ" میں آخرت کا ذکر "الاولیٰ" کے بالمقابل ہوا ہے۔ وہاں خدا تعالیٰ حضرت رسول اللہؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے:

آپ وحی منقطع ہونے سے آزردہ خاطر نہ ہوں
خدا نے آپ کو نہیں چھوڑا۔

"وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ"

"خدا آپ کی اُن خواہشات کو ضرور پورا کرے گا جو آپ لوگوں کو ہدایت دینے کے لیے رکھتے ہیں تاکہ آپ خوش ہو جائیں۔"

"وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ"

"اور آپ کا انجام کار آپ کے آغاز کار سے بہتر ہے۔"

یعنی آپ جتنا بھی آگے جائیں گے کمال کو پہنچیں گے۔

بہر حال یہاں جو فرمایا گیا ہے کہ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ یعنی جو لوگ قرآن کے ہدایت یافتہ ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ اس زندگی کے اوپر ایک دوسری زندگی ہے اور وہ وہی جہان ہے جہاں اعمال کا صلہ ملے گا۔

آخرت پر اعتقاد کا مطلب ہے آپ "جاودانگی" پر یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ دنیا اور آخرت کا فرق یہی ہے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے اور آخرت کا کوئی خاتمہ نہیں اور وہ ہمیشہ ہے خواہ انسان خوش بخت ہو خواہ بدبخت، البتہ بعض بدبختوں کی بدبختی وقتی ہے اور اس کے بعد انھیں دائمی خوش بختی حاصل ہو جائے گی بعض کی بدبختی دائمی ہے۔ "خلود" کا یہی مطلب ہے جس کا قرآن میں بار بار ذکر ہوا ہے۔

جاودانی پر یقین رکھنا دین خدا کی خاص صفت ہے۔ یہ ایسا نظریہ ہے جس کی روشنی میں دنیا کی توجیہ کی جا سکتی ہے کیونکہ مادی مکاتب فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جاودانی پر یقین نہیں رکھتے اور انسان کو ایک بلبلے کی طرح سمجھتے ہیں جو پھٹنے کے بعد فانی ہو جاتا ہے۔ مادی مکاتب فکر کا یہ نظریہ ہستی کے

تئیں بدگمانی نہیں تو اور کیا ہے ؟

یہ نتیجہ جو ان کے طرزِ فکر سے اخذ کیا گیا ہے انھیں سخت چراغ پا کرتا ہے یہی وجہ ہے ۔ اب بعض مادہ پرستوں نے چالاکی سے کام لینا شروع کر دیا ہے ۔ تاکہ وہ اپنے مکتب فکر کو بے بنیاد ہونے کے طعنے سے بچا سکیں۔

وہ کہتے ہیں ٹھیک ہے کہ فرد فانی ہو جاتا ہے لیکن چونکہ معاشرہ تکمیل کی طرف گامزن ہے لہٰذا یہ فرد اپنا سفر جاری رکھتا ہے اگر ہم تم مارے جائیں تو چونکہ ہمارا راستہ جاودانی ہے لہٰذا ہم بھی جاوید ہیں !!

ظاہر ہے وہ اپنے فلسفہ کا دفاع کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور یہ تاویل پیش کر رہے ہیں لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ کچھ لوگ قرآن کے مفاہیم کو مادی نظریات سے مطابقت دیں ۔ مثلاً وہ لوگ بالاخرۃ ھم یوقنون ۔ کا مطلب یہ نکالتے ہیں :

" دنیا کے ایک برتر اور مکمل نظام پر ایمان رکھتے ہیں "

یعنی فرد جاودان نہیں ، نظام دائمی ہے ۔

لیکن ان مادہ پرستوں سے یہ کہنا چاہیئے کہ ہم فرد کے جاوداں ہونے کے قائل نہ ہوں تو ہم یہ کہیں گے کہ نظام بھی جاوداں نہیں ۔ کیونکہ علوم طبیعیات کے ماہرین نے جو حساب لگایا ہے اس کے مطابق زمین کی عمر کروڑوں سال گزر جائے گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب نہ زمین رہے گی اور نہ اس پر انسان ۔ اس صورت میں نظام کے جاوداں ہونے کا کیا مطلب ؟

" اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ "

" وہ لوگ پروردگار کی ہدایت پر ہیں "

پروردگار دنیا کو پالنے والا ہے ۔ تمام موجودات کو ان کے کمال کی طرف

ہدایت کرتا ہے۔ بعض کو تکوینی ہدایت کے ذریعے۔ اور انسان کو تشریعی ہدایت کے ذریعے یعنی انسان کے لیے اپنے انبیاء بھیجے۔ لیکن صرف وہی لوگ تشریعی ہدایت کے ذریعے بھی کمال تک پہنچ سکے ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

"وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"

صرف یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"

اور باقی کوئی جماعت فلاح نہیں پائے گی۔

سورہ بقرہ میں ایمان کے بارے میں تعلیمات یہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد کفر کے بارے میں مضمون شروع ہوتا ہے۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ"

پہلے ضروری ہے کہ ہم دو الفاظ کی تشریح کر دیں اس کے بعد مذکورہ بالا آیت کے مفہوم پر بحث کریں گے۔

لفظ "کفر" کا ماخذ "کَفَر" ہے۔ جس کا مطلب "ستر" اور چھپانا ہے۔ قرآن دین کے منکروں کو کافر کہتا ہے۔ کیونکہ ان پر ایک حقیقت ظاہر کی گئی لیکن بجائے اس کے کہ وہ اسے تسلیم کرتے انھوں نے اسے چھپایا ہے۔

"انذار" اور "تخویف" کا لطیف فرق

"انذار" کا ترجمہ عموماً ڈرانا کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک بھرپور ترجمہ نہیں ہے۔ کیونکہ ڈرانا "تخویف" کا ترجمہ ہے۔

مثلاً ایک شخص سڑک پر جا رہا ہے۔ اچانک کوئی شخص اس کے

سامنے پٹاخہ چھوڑ دے تو وہ ڈر جائے گا۔ اسے عربی میں "تخویف" کہتے ہیں لیکن یہ "انذار" نہیں۔ انذار تو خطرے کی گھنٹی بجانا ہے۔ یعنی اگر کسی کا مستقبل خطرناک ہے اور آپ اسے زمانۂ حال میں مستقبل کی خبر دیں اور اسے ڈرائیں تو یہ "ڈرانا" - "انذار" کہلاتا ہے۔ ہمارے خیال میں "خبردار کرنا" اس مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ انبیاء خبردار کرنے والے ہیں۔

اب دیکھیے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

"جو لوگ کافر ہو گئے ہیں خواہ انھیں خبردار کرو، خواہ نہ کرو۔ لاحاصل ہے۔...."

اس کا کیا مطلب ہے؟

کیا لوگوں کو مومن ہونا چاہیے تاکہ انبیاء انھیں دعوت دے سکیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ پہلے ہی سے ایک حاصل شدہ مقصد کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ پیغمبر تو اس لیے آئے کہ کافروں کو مومن بنائیں نہ کہ مومنوں کو مومن۔

کچھ لوگ اس آیت کو لے اُڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصولی طور پر قرآن نے معاشرے اور تاریخ کی توجیہ کرتے ہوئے معاشرے کی مادی صورت میں توجیہ کی ہے۔ یعنی وہ لوگ کہتے ہیں کہ لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہیں۔ ایک وہ طبقہ جس کے حقوق غصب ہیں اور دوسرا وہ طبقہ جو حقوق غصب کر رہا ہے۔

پہلا طبقہ ہی دعوت قبول کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور اصولی طور پر انبیاء انہی کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ اور وہی طبقہ ان کا مخالف ہے جو حقوق غصب کرنے والا طبقہ رسول اللہؐ کی دعوت کے دائرے سے باہر ہے۔

حالانکہ یہ "تاویل قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ قرآن سب کو مخاطب کرتا ہے اور رسول اللہؐ کا روئے سخن بھی سب لوگوں کی طرف ہوتا ہے :

" یَآاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا "

(سورۂ اعراف آیت ۱۵۸)

" لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں "

" ناس " کا مطلب سبھی لوگ ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ناس یعنی محروم طبقہ تو وہ غلطی پر ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی بعثت سبھی کے لیے ہے۔ ان کی دعوت کالے، گورے، استعمار گر استعمار کا نشانہ بننے والے، امیر غریب سب کے لیے ہے۔

پھر اس آیت کا کیا مفہوم ہے ؟

قرآن کی اصطلاح میں سب موقعوں پر نہ سہی اکثر موقعوں پر "کافر" کا لفظ ہر غیر مسلمان کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ قرآن ایسے لوگوں کو کافر قرار دیتا ہے جن پر پیغمبر مبعوث کیا گیا اور انھیں دعوت حق دی گئی اور ان پر حقیقت روشن کی گئی لیکن انھوں نے اس دعوت کو جھٹلایا۔

یعنی پیغمبر کی دعوت سے پہلے نہ لوگ مومن ہیں نہ کافر اور نہ منافق۔ بلکہ "الناس" ہیں۔ پیغمبر آنے کے بعد اور دعوت دینے کے بعد وہ تین طبقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں :-

- ایک طبقہ مومنین کا۔
- ایک طبقہ صاف انکار کرنے والوں کا ـــــــ اور
- ایک طبقہ جو بظاہر دعوت قبول کر لیتا ہے لیکن باطن میں وہ مخالف ہے

اس آیت میں کفار سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو پہلے اسلام نہیں لائے بلکہ وہ لوگ ہیں جنھیں رسول اللہؐ نے دعوت دی اور انھیں سب کچھ معلوم بھی ہوا۔ مگر انھوں نے اپنے عقل و ہوش سے اس دعوت کا مقابلہ کیا اور رسول اللہ کو جھٹلایا۔

" وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ
ظُلْمًا وَعُلُوًّا "

(سورہ نمل آیت ۱۴)

" اور بے انصافی اور غرور سے انکار کیا لیکن ان کے
دل ان کو مان چکے تھے "

اگر انسان روحانی طور پر حقیقت کو تسلیم کرتا ہو تو جب اس کے سامنے حقیقت پیش کی جائے تو وہ اسے تسلیم کر لیتا ہے۔ جو چیز انسان کو ہلاکت میں ڈالتی ہے وہ حقیقت کے سامنے حیل و حجت کرنا ہے۔ جیسا کہ اکثر لوگ حقیقت کے سامنے اسی طرح کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیت میں اس ہٹ دھرمی کا خوب نقشہ کھینچا گیا ہے۔

" وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا
هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا
حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ "

(سورہ انفال آیت ۳۲)

" اور جب انھوں نے کہا کہ اے خدا اگر یہ قرآن
تیری طرف سے برحق ہے تو ہم پر آسمان سے
پتھر برسا۔ یا کوئی اور تکلیف دینے والا
عذاب بھیج "

یعنی بجائے اس کے کہ وہ کہتے اے خدا اگر یہ کتاب برحق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہمیں اسے قبول کرنے کی توفیق بخش۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"اگر برحق ہے تو ہمیں نیست و نابود کر۔"

یہ ہے حق کے سامنے اکڑنے کا مفہوم۔ اس قسم کے افراد کو "خبردار کرنا" بے سود ہے۔ اور فقہا کی اصطلاح میں یہ لوگ مقصر ہیں قاصر نہیں۔

مختصر یہ کہ ایسا نہیں ہے کہ جو کوئی مسلمان نہ ہو وہ کافر ہے بلکہ جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں "کفر" کا مطلب ہے انکار کرنا۔ چھپانا" اور یہ قرآن لوگوں کو کہا جاتا ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء اور دین حق لانے والوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انھوں نے مخالفانہ ردعمل ظاہر کیا اور ان کا [illegible]۔

اب ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ جن لوگوں کے سامنے اسلام بالکل [illegible] نہ کیا اور انھوں نے نہ مخالفت ظاہر کی نہ موافقت، انہیں ہم کیا نام دیں گے؟

جواب یہ ہے کہ بے شک وہ لوگ مومن نہیں ہیں اور ان پر مومن کے خاص احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان پر زیر بحث آیت کا بھی اطلاق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس دعوت انبیاء سے تین طبقے (مومن، کافر، منافق) پیدا ہوتے ہیں۔

مقدس کفر

ہم یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ چونکہ "کفر" کا بنیادی مفہوم وہی چھپانا، مخالفت کرنا، اور محاذ آرائی کرنا ہے لہٰذا بعض مقامات پر قرآن میں

اس لفظ کا استعمال اس سیاق و سباق میں ہوا ہے کہ اس سے ایک تقدس کی جھلک نظر آتی ہے۔ سب سے واضح جھلک آیت الکرسی میں ہے۔

"لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ....."

(سورۃ بقرہ آیت ۲۵۶)

"دین میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جو شخص طاغوت سے کفر رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں"۔

یعنی ہر مومن کو کافر بھی ہونا چاہیے۔ یعنی حق پر تو ایمان رکھے لیکن باطل سے کفر کرے۔ اس کو جھٹلائے۔ یہی "مقدس کفر" ہے۔

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ فروعِ دین دس ہیں۔ نویں اور دسویں "تولیٰ" اور "تبریٰ" ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو ولایت علیؑ ماننا چاہیئے۔ لیکن یہی کافی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ ایک منفی حالت بھی ہونی چاہیئے کہ علیؑ اور ان کے مکتب کے مخالف کی نفی اور انکار کرنا چاہیئے اس جگہ مفہوم یہ ہے کہ صرف اللہ پر ایمان کافی نہیں ہے بلکہ لازماً طاغوت کی نفی بھی کی جائے۔

"خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ"۔

جب خط لکھا جاتا ہے تو اس کے اختتام پر مہر لگائی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب اس خط میں کچھ نہیں لکھا جائے گا۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر شخص کا دل بھی خط کی طرح ہے جس پر بتدریج سطریں لکھی جاتی ہیں اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ خط ختم ہو جاتا ہے اور اسے سربمہر کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس پر ایک لفظ بھی نہیں بڑھایا جاتا۔ اس قسم کے لوگوں پر رسول اکرمؐ کی دعوت کا کچھ اثر نہیں اور قرآن نے رسول اللہؐ سے کہا ہے کہ اب انھیں دعوت مت دو۔

ایسا نہیں ہے کہ انھیں دعوت دینے کو شروع ہی سے لاحاصل قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ پہلے انھیں خبردار کیا گیا، انھیں دعوت دی گئی۔ ان پر اتمام حجت کی گئی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسے قبول نہ کیا اور کفر کیا۔ اس کفر اور انکار کرنے سے ان کے دل اس حالت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

قرآن انسان کو ایسی مخلوق سمجھتا ہے جو ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ انسان کے دل کو اس لیے قلب کہا جاتا ہے کہ یہ (تنقلب) اوپر نیچے حرکت کرتا رہتا ہے۔ تاہم ظاہر ہے قلب سے مراد گوشت کا وہ لوتھڑا نہیں جو سینے کے بائیں حصے میں ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد انسانی روح و روان ہے جو ہر لمحے اپنی حالت بدلتی رہتی ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

مثل القلب کمثل ریشة
فی الفلات تعلقت فی اصل
شجرة یقلبها الریح ظهراً
البطن۔ (بحوالہ نہج الفصاحۃ و جامع صغیر ج ۲ ص ۱۰۲)

" یعنی انسانی دل ایک پَر ہے جو بیابان میں ایک
درخت پر لٹکا دیا گیا ہو جسے ہوا ہمیشہ ہلاتی
رہتی ہے۔"

مولانا رومی نے اسی حدیث کو یوں منظوم کیا ہے:

گفت پیغمبرؐ کہ دل ہمچون پَری است
در بیابانی اسیر صرصری است
باد پَر را ہر طرف راند گزاف
گر چپ و گر راست باصد اختلاف

انسان دو وقتوں میں ایک حالت میں نہیں رہ سکتا۔ وہ سب سے زیادہ اپنے اعمال سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک نورانی کام اسے نُور بخشتا ہے اور ایک بُرا کام انسان سے روشنی چھین لیتا ہے اور اسے تاریک کر دیتا ہے۔ نیک کام انسان کو نرم بنا دیتا ہے اور اسے حق اور حقیقت قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن انسانی فطرت کے خلاف اعمال دل کو پتھر بنا دیتے ہیں اور ایک وقت تو ایسا آتا ہے کہ دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

قرآن دل کی ایسی حالت کو یوں بیان کرتا ہے:

" خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی
سَمْعِہِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِہِمْ
غِشَاوَۃٌ۔"

" خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی
ہے اور ان کی آنکھوں پہ پردہ ہے۔"

(سورہ بقرہ آیت ۷)

یہ کفر کی علامتیں ہیں، کفر کے اسباب نہیں۔ ہمارے خیال میں اس مختصر تشریح سے ایمان اور کفر کا مسئلہ کافی حد تک واضح ہوگیا ہے۔

" وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ ....

...... وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ "

(سورۃ بقرہ آیات ۸ تا ۱۶)

ترجمہ:

" اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔ یہ خدا کو اور مومنوں کو چکمہ دیتے ہیں مگر اپنے سوا کسی کو چکمہ نہیں دیتے اور اس سے بے خبر ہیں۔ ان کے دلوں میں مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کردیا اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ دیکھو یہ بلاشبہ مفسد ہیں لیکن خبر نہیں رکھتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لے آئے تم بھی ایمان لے آؤ۔ تو کہتے ہیں بھلا جس طرح بیوقوف ایمان لے آئے ہیں اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟ سن لو کہ یہی بے وقوف ہیں لیکن نہیں جانتے اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم

ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں اور (پیروانِ محمدؐ سے) تو ہم ہنسی کیا کرتے ہیں۔ ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انھیں مہلت دیے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ تو ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔"

تفسیر:۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ"

چونکہ نفاق کفر سے زیادہ خطرناک ہے لہٰذا یہاں قرآن مجید میں کفر کے بارے میں تو صرف چند آیات میں ہی بحث کی گئی ہے۔ لیکن نفاق پر کئی آیات موجود ہیں اور قرآن مجید کی تیرہ سورتوں میں مختلف صورتوں میں منافقین کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور سورہ نمبر ۶۳ کو سورۂ منافقون کا نام دیا گیا ہے۔

نفاق کیا ہے؟

نفاق یعنی دو روپ ہونا۔ یعنی انسان کا اصل کچھ ہو اور دکھاوا دوسرا ہو اگرچہ یہ خصلت قابل مذمت ہے لیکن یہ انسانی کمال کی مظہر ہے۔ وہ اس طرح کہ انسان حیوانات کے درمیان مکمل تر مخلوق ہے لہٰذا وہ بناوٹ اور ظاہر سازی پر قادر ہے۔ لیکن دوسرے حیوانات اکثر و بیشتر نفاق کی طاقت نہیں رکھتے صرف

کچھ ایسے حیوانات جو ہوش وحواس کی نظر سے قدرے مکمل نز ہیں وہ کسی حد تک بناوٹ سے کام لے سکتے ہیں۔

مثلاً کبھی مرغ یا گھوڑا یا گدھا نفاق سے کام نہیں لے سکتا۔ لیکن بلی کسی حد تک ایسا کر سکتی ہے اور چوہے یا چڑیا کو شکار کرتے وقت اپنی اس صلاحیت سے فائدہ بھی اٹھاتی ہے۔ یعنی خود کو چھپائے رکھتی ہے اور اپنا شکار دبوچ لیتی ہے۔ لومڑی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی مکاری تو ضرب المثل بن چکی ہے۔ بھیڑیا بھی اپنے مکر و فریب سے اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔

لیکن کوئی حیوان انسان کی طرح بناوٹ سے کام لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ انسان کی اس حرکت پر ادبی اصطلاحات اور ضرب الامثال موجود ہیں۔ مثلاً جو فروشی اور گندم نمائی۔

ہم نے جو یہ کہا ہے کہ نفاق انسان کے تکامل کی ایک علامت ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان جتنا گنوار اور اجڈ ہوگا اتنا ہی اس میں نفاق کم ہوگا۔ مثلاً بچوں میں نفاق نہیں ہوتا۔ انھیں کسی بھی محفل میں جو کھانا بھی پیش کیا جائے گا اگر وہ اسے پسند کرتے ہوں تو فوراً کھا لیں گے بلکہ اگر وہ اس کھانے سے رغبت رکھتے ہوں تو کھانا پیش کرنے سے پہلے ہی وہ رو کر اپنی رغبت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ لیکن بڑا آدمی جب ایک محفل میں جاتا ہے تو باوجود کسی کھانے کو پسند کرنے کے جب اسے کھانے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے:

"جی نہیں چاہ رہا"

لیکن بچہ ایسا جھوٹ نہیں بولتا۔

انسان جتنا تہذیب یافتہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں منافقت بڑھتی جا رہی ہے ہزار سال پہلے کے آدمی میں آج کے آدمی کا ...ہر حصہ نفاق بھی نہیں تھا۔

کیا آپ کی توجہ اس طرف ہے کہ آج کئی الفاظ رائج ہیں جو منافقانہ ہیں مثلاً لفظ "استعمار" جو اصل میں بہت اچھا لفظ ہے اور قرآن میں بھی اس کا استعمال اپنے اصلی مفہوم میں ہوا ہے :

"هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ..."

(سورۂ ہود۔ آیت ۶۱)

"اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا"

استعمار باب استفعال سے ہے اور اس کا مادہ "عمران" ہے یعنی تم سے زمین کو آباد کرنا مانگا۔ تم کو روئے زمین پر پیدا کیا اور تم کو ذمہ دار ٹھہرایا کہ زمین کو آباد کرو۔ یعنی استعمار کا مطلب ہے کسی چیز کو آباد کرنا۔

استعمار گر ممالک بھی جہاں جاتے یہی کہتے کہ ہم تمہارے مفادات ہڑپ کرنے نہیں آئے بلکہ تمہاری سرزمین آباد کرنے آئے ہیں (نوآبادیاتی کی اصطلاح سے یہ مفہوم واضح ہے) بظاہر وہ یہی کام کرتے تھے۔ یعنی ایک دو سڑکیں بنا دیں۔ لیکن لوگوں کو جتنا وہ فائدہ پہنچاتے تھے۔ اس سے کئی گنا فائدہ ان سے حاصل کر لیتے۔ اس طرح ان ممالک کے عوام کو اپنا غلام بنا لیتے۔ لہٰذا "استعماریت" ایک منافقانہ لفظ ہے۔ یعنی ایک طرف اگرچہ اس کا لفظی مطلب آبادی ہے لیکن اسے صحیح عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا۔

عیسائی مبلغین کو ان کی اپنی اصطلاح میں "مبشرین" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ استعمار کا ہراول دستہ تھے۔ یعنی جس ملک کو نوآبادیاتی بنانا مقصود ہوتا پہلے وہاں عیسائی مشنریاں کام کرتیں اور لوگوں کا دھیان حضرت عیسیٰؑ کی مسیحائی اور ان کی ولادت

مریم عذرا کے کمالات میں بتاتے۔ لیکن تھوڑا عرصہ گزرتا تو لوگوں کو پتہ چلتا کہ مذہب کی آڑ میں ان کا سارا مادی سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔

ایک افریقی باشندے کا کہنا ہے کہ:

"جب فرنگی ہمارے ممالک میں آئے تو ہمارے
پاس زمین تھی اور ان کے ہاتھ میں انجیل تھی۔ لیکن
چالیس پچاس سال گزرنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ
انجیل ہمارے ہاتھ میں ہے اور زمین ان کے پاس ہے۔"

اسے کہتے ہیں منافقت!

قرآن میں منافقین کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ منافقوں سے ہوشیار رہیں اور ان کا فریب نہ کھائیں۔ کیونکہ منافقوں کا تعلق صرف صدر اسلام سے نہیں بلکہ ہر زمانے میں منافق موجود رہے ہیں جو مسلمانوں کی صفوں میں رخنہ ڈالتے رہتے ہیں۔ وہ دکھاوا تو اسلام کا کرتے ہیں لیکن پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں۔

پانچویں کالم کی اصطلاح آپ نے ضرور سنی ہو گی۔ غالباً یہ پہلی عالمگیر جنگ کا واقعہ ہے کہ کسی ملک کی فوج میں چار لشکر تو علانیہ تھے جو آتشیں اسلحے کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتے لیکن وہ ایک لشکر کو پہلے ہی دشمن کی صفوں میں بھیج دیتے تاکہ انھیں غافل کر دیں۔ چار لشکروں کے حملے سے پہلے یہ پانچواں لشکر خفیہ طور پہ کام کرتا تھا اس کا کام دشمن کی صفوں میں گھس کر ان کے ساتھ محبت اور گرم جوشی کا مظاہرہ کرنا ہوتا لیکن اصل میں وہ اپنے لشکروں کے لیے کام کر رہے ہوتے تھے۔

ہمیشہ اسلامی معاشرے کو جو خطرہ لاحق ہے وہ پانچویں کالم سے ہے جس کا ذکر اس آیہ میں ہوا ہے۔ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ۔ جو لوگ کہتے ہیں

ہم خدا اور روزِ قیامت پر ایمان لائے ۔ وہ اصل میں جھوٹ بکتے ہیں۔

"یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ....."

اگر یہ کہا گیا ہوتا "یَخْدَعُوْنَ اللّٰہَ" یعنی خدا کو فریب دیتے ہیں — لیکن خدا کو فریب نہیں دیا جا سکتا اور یہ محال ہے۔ لہٰذا کہا گیا یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ خدا کے ساتھ فریب کرتے ہیں۔

"مخادعہ" باب مفاعلہ سے ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ دھوکہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی اس پوزیشن میں ہیں کہ خدا کے ساتھ دھوکا کریں۔

"وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ....."

جو آدمی خدا کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ وہ دراصل خود کو دھوکہ دیتا ہے۔

کیوں ــــ ؟

اس لیے کہ حقیقت اور واقعیت کو کبھی فریب نہیں دیا جا سکتا۔ جو شخص حقائق کو دھوکہ دینے کی فکر کرتا ہے۔ وہ درحقیقت خود کو دھوکہ دیتا ہے۔ حکیم کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے حکمت کو نہیں۔

مثلاً ایک بیمار شخص اپنے طبیب سے جھوٹ بول کر اسے دھوکہ دے سکتا ہے۔ فرض کریں جب طبیب، مریض سے پوچھتا ہے کہ:

"جو دوا میں نے تمھیں دی تھی وہ کھا لی ہے یا نہیں؟"

تو وہ جواب دے کہ:

"ہاں کھا لی ہے۔"

حالانکہ اس نے نہ کھائی ہو اور نہ ہی وہ طبیب کے مشوروں پر عمل کرتا ہو،

لیکن طبیب سے کہہ دے کہ وہ ان پر عمل کر رہا ہے۔ اس طرح طبیب تو دھوکہ کھا جائے گا لیکن طب کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ خود مریض نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ کیونکہ طبیب تو مریض کے بیانات کی روشنی میں نسخہ تجویز کرتا ہے۔ اور اس طرح جھوٹ بولنے والے منافق مریض شخص کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

مسلمانوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن خدا کو جو کہ عین حق اور حقیقت ہے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ ایسا کرنے والے دراصل خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔

"یخٰدِعُوْنَ اللّٰہ" کے جملے سے یہ احتمال بھی پایا جا سکتا ہے کہ منافق کبھی خدا کو دھوکہ دینے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے کیونکہ وہ تو سرے سے خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتے جو خدا کو دھوکہ دینے کے بارے میں سوچیں۔ اور اگر خدا پر ایمان رکھتے ہوں تو ایسا شخص خدا کو دھوکہ دینے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس صورت میں یہ جملہ ہمیں یوں سمجھنا چاہیے کہ خدا جو کام اہل حق سے متعلق سمجھتا ہے اسے اپنے ساتھ نسبت دیتا ہے۔ اس کی مثال قرآن مجید میں ہے:

"إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا
يُبَايِعُونَ اللَّهَ"

"جنھوں نے آپ کے ساتھ بیعت کی انھوں نے
خدا کے ساتھ بیعت کی۔"

(سورۃ فتح۔ آیت ۱۰)

یہاں مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اہل ایمان کو فریب دینے کے درپے ہیں۔ وہ درحقیقت اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں کیونکہ جو لوگ حق کے راستے پر ہیں اور صراط مستقیم پر چل رہے ہیں اور ان کی آخری منزل "اللہ" ہے۔ وہ خود کو

حقیقت کے سپرد کر چکے ہیں اور یہی جذبہ تسلیم و رضا ہے جو انھیں نجات بخشتا ہے خواہ وہ لوگ بظاہر چالاک اور زندگی میں کامیاب کیوں نظر نہ آئیں۔

لیکن جو لوگ خود کو چالاک سمجھتے ہیں اور ہمیشہ دھوکہ دے کر آگے بڑھتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کے معاملے میں بھی اہل حق کو دھوکہ دے کر اپنی مراد پا لی جا سکتی ہے۔

لیکن حق اور حقیقت کو کبھی دھوکہ نہیں دیا جا سکتا خواہ اہل حق فریب کھا جائیں۔ اس طرح جو لوگ چالبازی سے کام لیتے ہیں اس کا وبال خود انہی پر ہوتا ہے۔

"فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ"

اس آیت میں خدا نے اصل وجہ بتائی ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ ان کے دل کے اندر چور ہے۔ وہ روحانی اور نفسیاتی مریض ہیں۔

دل کی بیماریوں کا قرآن میں مختلف مقامات پر ذکر ہوا ہے اور بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً تکبّر کی بیماری ــــ تعصب کی بیماری ــــ قدامت پرستی کی بیماری ــــ باپ دادا کے نقش قدم پر چلنے کی بیماری ــــ بڑوں کی تقلید کی بیماری۔ یہ سب روحانی بیماریوں کے نام ہیں جو انسان کو حقیقت تسلیم کرنے نہیں دیتیں۔ بالکل فسق و فجور کی طرح جو انسان کے اندر عدم تسلیم کی حالت پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ ایسے بیمار ہیں جن کی بیماری خدا ہمیشہ بڑھاتا رہتا ہے کیونکہ جو قانون انسان کے جسم میں کارفرما ہے وہی قانون انسان کی روح میں بھی کام کرتا ہے

اگر کوئی جسمانی طور پر بیمار ہو تو حکیم کے پاس جاتا ہے۔ اگر مریض حکیم سے بات چھپائے یا اس کے مشوروں پر عمل نہ کرے تو یہ اس کی منافقانہ حرکت ہے۔ اس کا اثر ظاہر ہے بیماری کی شدت ہوگی۔

خدا نے اس دنیا کو ایک کھیت قرار دیا ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس میں کیا بوتا ہے۔ گندم سے گندم اُگے گی اور جَو سے جَو۔ حنظل کا پھل حنظل ہے اور خرما کا خرما۔

قرآن کہتا ہے:

"كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ"

(سورۃ اسرا آیت ۲۰)

خدا کا کام مدد کرنا ہے اور دنیا کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی ہے کہ ہر کوئی اپنے راستے پر چلتا ہوا تکمیل تک پہنچے۔ خواہ وہ جو نیکوکار ہیں خواہ وہ جو بدکردار ہیں (البتہ ایک فرق کے ساتھ جس کا ذکر آگے آئے گا۔)

"وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ"

اس سے پہلے قرآن مجید میں منافقوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اس آیت سے منافقوں کی خود فریبی بخوبی واضح ہے۔

کہتے ہیں کہ جھوٹے آدمی چونکہ دوسرے لوگوں سے جھوٹ بولتے ہیں اس لیے آہستہ آہستہ وہ اپنے جھوٹ کو بھی سچ سمجھنے لگتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ اس جھوٹ اور افواہ کو خود انھوں نے گھڑا ہے۔

ایک حکایت ہے:

"کچھ بچے ایک بے وقوف شخص کے درپے ہو گئے

بچّوں کو بھگانے کے لیے اس نے ان سے کہا۔ شہر کے
فلاں محلے میں خیرات بٹ رہی ہے۔ بچّوں نے یقین کر لیا
اور وہاں سے چلے گئے۔ جونہی بے وقوف شخص نے
دیکھا کہ سب بچے اس طرف دوڑ گئے ہیں وہ خود بھی
اس طرف چل پڑا اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔ شاید
وہاں خیرات بٹ رہی ہو۔"

قرآن کہتا ہے کہ پانچویں کالم کے ان بندوں کا کام مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا اظہار ہے مگر اندر سے وہ مسلمانوں کی جڑیں کاٹ رہے ہیں اور اسلام کے مقدس مقاصد کو تباہ کر رہے ہیں۔

جب ان کے بعض دوست انھیں خبردار کرتے ہیں کہ اس قدر فساد نہ کریں تو وہ جواب میں کہتے ہیں:

"اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔"

ہم تو مصلح ہیں ——— (مفسد نہیں)۔

"اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔"

حقیقت میں مفسد تو یہی ہیں لیکن یہ نہیں جانتے
بے خبر ہیں ——— (اور سمجھتے ہیں کہ مصلح ہیں)۔"

اگر آپ گہری نظر سے دیکھیں تو قرآن کی اس آیت میں بات منحصر کر دی گئی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں:

"زید عالم ہے۔"

پھر کہتے ہیں: "عالم زید ہے۔"

دوسرا جملہ یہ تاثر اور مفہوم دیتا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی عالم ہے تو وہ زید ہے۔ باقی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ قرآن میں بھی اس مقام پر یہی انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اصل میں مفسد تو یہی لوگ ہیں۔ یعنی ان کے مقابلے میں دوسرے مفسد کسی گنتی میں نہیں ہیں۔ کیونکہ فساد اور تباہ کاری ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے لیکن یہ نہیں جانتے۔

"وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْآ اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ"

جب ان سے خلوت میں کہا جاتا ہے کہ اس منافقت کو ترک کر دیں اور آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ایمان لانا اور مذہبی ہونا تو بے عقل اور بے شعور لوگوں کا کام ہے۔ کیا ہم جو کہ معاشرے کے روشن خیال لوگ ہیں ان احمق لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ ہرگز نہیں۔

"اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ"

قرآن لفظ "اَلَآ" کہہ کر مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے (جیسا کہ سابقہ آیت میں بھی کہا گیا: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ) قرآن فرماتا ہے:

"خبردار رہیں احمق وہی لوگ ہیں اور اس طرح خیالات کی تاریکی میں گم ہیں کہ خود بھی نہیں جانتے"

جہالت دو قسم کی ہے۔ جہلِ بسیط ـــــ اور ـــــ جہل مرکب۔ جہل بسیط وہ ہے کہ انسان کسی چیز کو نہیں جانتا اور اسے خود بھی علم ہوتا ہے کہ وہ نہیں جانتا۔ اس قسم کی جہالت جلد ہی دور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب انسان کو یہ علم ہو کہ وہ

کسی چیز کو نہیں جانتا تو وہ اسے جاننے کی کوشش کرتا ہے اور کم از کم دوسروں کی بات دھیان سے سنتا ہے تاکہ اگر حقیقت ہے تو اسے مان لے۔ بہر حال یہ جہالت زیادہ خطرناک نہیں۔

جہل مرکب یہ ہے کہ انسان کوئی چیز نہیں جانتا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ بیخبر ہے۔ اس قسم کی جہالت لاعلاج ہے۔ اس کا غرور اس کی جہالت مٹنے نہیں دیتا۔ جب کہ روشن خیالی کے اکثر مدعی اس بیماری کا شکار ہیں۔ کیونکہ وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ اس لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

بو علی سینا اپنی کتاب "اشارات" میں ایک خوبصورت جملہ لکھتے ہیں:

ایاك و فطانة بتراء"

ابتر چالاکی سے ڈرنا چاہیے۔ یعنی ناقص چالاکی سے

مطلب یہ کہ انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ سادہ رہے یا عاقل اور مکمل طور پر خبردار۔

سادہ لوح لوگ خود بھی جانتے ہیں کہ وہ سادہ ہیں۔ لیکن آدھے چالاک لوگ جو بعض معاملات میں چالاک ہوتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت چالاک ہیں اور ہمیشہ اپنے کاموں کو دانشمندانہ تصور کرتے ہیں۔ اس قسم کے افراد احمق ترین افراد ہیں۔

غزالی نے کیا پتے کی بات کہی ہے:

"ہر چیز کا ناقص ہونا اس کے مکمل طور پر نہ ہونے سے بہتر ہے مگر علم و دانش کے سوا۔"

مثلاً صحت یا دولت جتنی بھی ہو اس سے بہتر ہے کہ بالکل نہ ہو لیکن علم و دانش کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ تھوڑا پڑھا لکھا آدمی ان پڑھ شخص سے بدتر ہے۔ اس لیے کہ وہ یہ سمجھتا ہے وہ بہت پڑھا لکھا ہے اور کبھی اپنی تکمیل کی کوشش

نہیں کرتا۔ غالبًا سنائی غزنوی نے کہا ہے ؎

رنجش ہر کسی زیک چیز است
رنجش من ز نیم دیوانہ است

یہ شاعر کہتا ہے:

"ہر کسی کو کسی ایک چیز کا دکھ ہے۔ مجھے یہ غم
ہے کہ میں نیم دیوانہ ہوں"

عقل بھی علم کی طرح ہے، یا انسان کو مکمل دیوانہ ہونا چاہیے یا مکمل عاقل۔ آدھے عاقل اور آدھے دیوانے شخص سے مکمل دیوانے شخص کی نسبت زیادہ نقصان پہنچتا ہے[1]

معاشرے کے چالباز اور فریب کار لوگ تقریبًا یہی "آدھے" افراد ہیں۔ یعنی وہ جن کے پاس آدھی حکمت ہے، مکمل نہیں۔

کیونکہ مکمل ہوشیار آدمی اگر کسی چیز پر یقین نہ رکھتا ہو تو کم از کم یہ تو ضرور سمجھتا ہے کہ خوش بختی اور کامیابی کا راز سچائی میں ہے۔ لیکن آدھے ہوشیار لوگ جن سے اکثر مجھے واسطہ پڑا ہے۔ اپنی کامیابی اس میں سمجھتے ہیں کہ کسی سے سچ نہ بولیں ایسے لوگ اپنی پوری زندگی میں ایک دوست بھی نہیں بنا سکتے۔ اور نہ ہی ان کی باتوں پر کوئی اعتماد کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جس سے بات کرتے ہیں سب جانتے ہیں کہ وہ چالاکی سے کام لے رہے ہیں۔

قرآن ان منافقوں کو جاہلِ مرکب سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ نہیں جانتے مگر وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔ وہ شعور نہیں رکھتے مگر سمجھتے ہیں کہ باشعور ہیں

---

[1] "صداقت کھاہی" کا مقولہ ہے کہ آدھے سر کا درد پورے سر کے درد سے کم نہیں ہوتا۔ اور یہ بات تو ضرب المثل ہے۔ "نیم حکیم خطرۂ جان" مترجم

" وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ "

ان کے دوغلے پن کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے کہ :

"جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم مومن ہیں لیکن جب وہ اپنے شیاطین (یعنی اپنے طبقے کے روشن خیال آدمی) سے خلوت میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اہل ایمان کو تو ہم بے وقوف بنا رہے ہیں ورنہ عقیدے اور فکر کے لحاظ سے ہم آپ جیسے ہیں) "

پہلی آیت میں کہا ہے وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ اور اب یہاں کہا گیا ہے :

" اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ "

یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے اور اس کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ان کی بھول ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت ان کا مذاق اڑاتی ہے۔ یعنی ان کے کام کا نتیجہ خود ان کا تمسخر اڑاتا ہے۔

" وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ "

یہ سرکش لوگ ہیں اور خدا ان کو ان کی سرکشی میں مبتلا کرتا ہے۔ اس حد تک کہ خود وہ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ نہیں پاتے کہ کیا کریں۔

منافقوں کی خصلتیں

جو بحث ہو چکی ہے اس کے مطابق قرآن نے منافقوں کی کئی خصلتیں بیان کی ہیں :

(۱) —— منافق دکھاوا کرتے ہیں اور دکھاوا اصولی طور پر ایک منافق کی صفت ہے۔ یعنی منافق، مومن سے بڑھ کر ایمان کا اظہار کرتا ہے۔

(۲) —— منافق چالباز ہیں۔ فریب دیتے ہیں۔ یہ ان کی نمایاں صفت ہے۔

(۳) —— یہ ایک نفسیاتی اور روحانی بیماری میں مبتلا ہیں جو ایسے کاموں سے اپنی داخلی کمزوریوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنے سے ان کے دل اور روح کی بیماری ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔

(۴) —— ان پر بات اس قدر مشتبہ اور مشکوک ہو چکی ہے کہ وہ خود بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے کام معاشرے کی اصلاح کے لیے ہیں۔ یعنی انھوں نے اپنی تباہ کاریوں اور فتنہ پردازیوں کو اصلاح کا جامہ پہنا رکھا ہے اور انھیں اس کا یقین بھی ہے۔

(۵) —— خود یہ لوگ احمق ہیں اور دوسروں کو بھی احمق خیال کرتے ہیں۔

(۶) —— یہ دوغلے ہیں۔ یہ ایک محفل میں جو بات کرتے ہیں دوسری محفل میں بالکل اس کے برعکس بات کرتے ہیں۔

یہاں چند نکات قابل غور ہیں۔

"ناس" کا مفہوم

۱۔ پہلی بات آیہ" ومن الناس من یقول آمنا..... بعض لوگ یوں کہتے ہیں": میں لفظ "ناس" کے بارے میں ہے۔
قرآن میں یہ لفظ ہمیں کثرت سے نظر آتا ہے۔
اس کا مطلب کیا ہے؟

قرآن میں "ناس" کا مطلب ہے لوگ۔ کیونکہ لوگوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ غنی ـــ فقیر ـــ عالم ـــ جاہل ـــ سفید۔ سیاہ ـــ ظالم ـــ مظلوم ـــ وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم انسانوں کو دیکھیں اور اختلاف و تنوع کو ایک طرف رکھ دیں۔ یعنی ان کے رنگوں اور شکلوں اور طبقوں پر نظر نہ رکھیں اور انسانوں کو صرف انسان کے لباس میں دیکھیں تو اسی اعتبار سے ہم لوگوں کے لیے لفظ "ناس" استعمال کرتے ہیں جو تمام بنی نوع انسان کے شامل حال ہوتا ہے۔ ایسا انسان جس کے لیے رنگ، شکل، طبقہ، دین اور طرز خیال کی کوئی شرط نہیں۔ یعنی فلاسفہ کی اصطلاح میں" انسان لابشرط"۔

مفسرین نے شروع ہی سے لفظ "ناس" کی مذکورہ تفسیر کی ہے۔ اور صحیح کی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور کہتے ہیں کہ ناس کا مطلب ہے ایسے لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ یعنی گلی کوچوں کے لوگ، محروم طبقہ، بے چارگی کے مارے لوگ۔ اس صورت میں "ناس" کا اطلاق صرف ایک مخصوص طبقے پر ہوتا ہے اور وہ سب لوگوں کے شامل حال نہیں ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں "ناس" سے مراد

جیساکہ ہم نے پہلے کہا ہے تمام لوگ ہیں۔ اپنی کسی خاص وضع ، دین ، غربت ، بے نیازی ، رنگ ، علم ، جہالت کے امتیاز کے بغیر۔

قرآن مجید میں ہے :

"یَا اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّکُمُ...."

(سورہ بقرہ۔ آیت ۲۱)

کیا اس آیت سے یہ واضح نہیں کہ قرآن کا مخاطب صرف عوام الناس نہیں بلکہ تمام انسان ہیں۔

سورہ آل عمران ، آیت ۹۷ میں ارشاد ہوتا ہے :

"وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً"

خدا نے سب لوگوں کے لیے حج قرار دیا ہے۔ کچھ لوگوں پر نہیں۔ البتہ بعد کے جملہ : "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً" سے اسے مشروط کر دیا ہے کہ جو لوگ استطاعت رکھتے ہوں۔

بعض مقامات پر "ناس" ، کفار کے لیے بھی کہا گیا ہے۔ جیساکہ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۷۳ میں ہے :

"اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ"

اس آیت کا تعلق ایک واقعہ سے ہے۔ کفار مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے پہلے ہی یہ افواہ پھیلا رکھی تھی کہ "لوگ" مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے دلوں میں دہشت اور رعب ڈالنا چاہتے تھے۔

اسی آیت میں " ناس " کا اطلاق منافقین پر بھی ہوتا ہے :

" وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ ..... "

" لوگوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں ... "

جو مفسرین " ناس " کو عوام الناس اور گلی کوچوں کے لوگوں کے مفہوم میں لیتے ہیں وہ اس مقام پر مجبور ہو گئے ہیں کہ منافقین کو بھی عوام کے اسی طبقے میں شمار کریں ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ منافق ہر طبقے سے ہو سکتا ہے اور اتفاق سے صدر اسلام کے منافقین جن کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے وہ مدینہ کے امراء میں سے تھے ۔

رسول اکرمؐ کے زمانے میں منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تھا جو رسول اللہؐ کی مدینہ آمد سے قبل وہاں کا ممتاز ترین آدمی تھا ۔ یہاں تک کہ وہاں کے لوگ اتفاق رائے سے اسے اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے تاکہ اوس اور خزرج قبائل کے گہرے اختلافات ختم ہو سکیں ۔ مدینہ کے لوگ اس کے لیے تاج بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے ۔

ایسے موقع پر جب کہ عبداللہ بن ابی اپنے لیے بادشاہت کو مسلم سمجھ رہا تھا ۔ اسلام نے مکہ میں ظہور کیا اور مدینہ کے جو لوگ مکہ سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے رسول اکرمؐ سے ملاقات کی اور مسلمان ہو گئے ۔ اور رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ وہ مدینہ میں کوئی مبلغ بھیجیں ۔

رسول اللہؐ نے مصعب بن عمیر کو بھیجا اور مدینہ کے کئی لوگ اسلام لے آئے اور اس طرح رسول اللہؐ کے لیے مدینہ ہجرت کرنے کا راستہ ہموار ہو گیا ۔ اور اس طرح عبداللہ بن ابی کے سارے انتظامات اور خواب درہم برہم ہو گئے اور اس کے دل میں اسلام کا کینہ جڑ پکڑ گیا ۔

جب مدینہ کی اکثر آبادی مسلمان ہو گئی تو اس شخص کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اسلام کا دکھاوا کرے لیکن اس نے کبھی اسلام کو دل سے قبول نہیں کیا۔

بہر حال یہاں 'ناس' کا مطلب معمولی لوگ نہیں اور اس کی مثال یہی عبداللہ بن ابی ہے جو منافقین کا سرکردہ تھا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ مدینہ کا مالدار شخص تھا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہاں قرآن مجید میں کفار کے بارے میں دو آیات اور مومنوں کے بارے میں تین یا چار آیات بیان کی ہیں۔ لیکن جب منافقوں کی باری آتی ہے تو اس بارے میں تیرہ آیات میں بحث کی جاتی ہے۔

مزید قابل غور بات یہ ہے کہ منافقوں سے متعلق ان آیات کو چند بار لفظ "الا" (یعنی خبردار رہیں۔ خبردار رہیں) سے شروع کیا گیا ہے۔ قرآن نے منافقین کو متعارف کرنے کا اتنا اہتمام کیوں کیا ہے؟ مفسرین نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اگرچہ منافق کافر ہی کی ایک قسم ہے لیکن جیسا کہ قرآن مجید کی بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ منافق کافر کی نسبت اسلام کے لیے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ کافر کو قرآن اصطلاحاً کافر کہتا ہے۔ یعنی وہ کافر ایسا ہے جو کھلے عام خدا اور رسولؐ سے انکار کرتا ہے اور لوگوں کا اس کے ساتھ برتاؤ واضح ہے۔ لیکن جس شخص نے اپنے قلبی عقیدے پر پردہ ڈالا ہوا ہے اور زبان سے کچھ کہتا ہے اور دل میں کچھ اور چھپا رکھا ہے۔ وہ شخص زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دیتا ہے۔ لوگ کافروں سے کبھی دھوکہ نہیں کھاتے۔ اس لیے کہا گیا ہے:

"اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ
مِنَ النَّارِ"

(سورۃ نساء آیت ۱۴۵)

"کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے
نچلے درجے میں ہوں گے۔"

تاریخ اسلام اٹھا کر مطالعہ کیجیے۔ حضرت رسول اکرمؐ نے جو جنگیں کیں ان میں فتح یاب ہوئے کیونکہ ان کی جنگ ایسے لوگوں سے تھی جو اپنے کفر میں سچے اور آشکار تھے اور اپنے کفر میں منافقت نہیں کرتے تھے۔ جب رسول اللہؐ انھیں لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہ کہنے کی تلقین کرتے تو وہ صاف انکار کر دیتے۔

جب ابوسفیان، رسول اللہؐ کے مقابلے میں آکر "اعلیٰ ھبل، اعلیٰ ھبل" کا نعرہ لگاتا تو رسول اللہؐ اس کا جواب "اللہ اعلیٰ واجل" دیتے۔ یعنی اللہ اور ہبل بالمقابل تھے۔ لہٰذا اس مقابلے کا نتیجہ بھی ظاہر تھا۔ اللہ کی کامیابی اور ہبل کی شکست۔

علیؑ کا مقابلہ انہی ابوسفیانیوں سے تھا۔ لیکن ان کے نعرے اسلامی تھے۔ معاویہ جو ہمیشہ اپنے باپ ابوسفیان کے مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا تھا اگر "اعلیٰ ھبل" کا نعرہ لگاتا تو صد در صد علیؑ سے شکست کھا جاتا۔ لیکن اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور اسلام کے لیے آنسو بہاتا ہوا یہ نعرے لگاتا تھا:

"ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا
لولیہ سلطاناً فلا یسرف فی القتل
انہٗ کان منصوراً"

اور چیختا تھا کہ:

"رسول کا خلیفہ عثمان شہید ہوگیا ہے۔ اے لوگو! کیا یہ
ممکن ہے کہ خلیفہ کا خون رائیگان جائے ؟"

اس طرح عوام کو بڑے پیمانے پر عثمان کے خون کا انتقام لینے کے لیے آمادہ کرتا تھا۔ پھر قاتلان عثمان کے سربراہ کے طور پر علیؑ کو متعارف کرایا۔

حالانکہ عثمان کا واقعی قاتل خود معاویہ ہے۔ جیسا کہ علیؑ نے نہج البلاغۃ میں بیان کیا ہے:

"وھم یطلبون دما ھم سفکوہ!"

اور مزید فرماتے ہیں کہ :

"جب عثمان نے مدد چاہی تم نے اس کی مدد کیوں
نہ کی۔ اس لیے مدد نہ کی کہ جب وہ قتل ہوجائے تو
اس قتل سے فائدہ اٹھاؤ۔"

معاویہ نے اپنے جاسوس مدینہ میں تعینات کیے تھے تاکہ جیسے ہی عثمان کا قتل ہوجائے فوراً اس کا خون آلود لباس شام پہنچایا جائے۔ جاسوسوں نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس پیراہن کو ایک عرصے تک شام کی مسجد میں لٹکائے رکھا اور معاویہ عموماً عوام کی نظروں کے سامنے عثمان کے سوگ میں رویا کرتا تھا اور سر اور سینہ پیٹتا تھا اور اس طرح سادہ لوح عوام خدا کے لیے آمادہ جنگ ہوجاتے اور راہ خدا میں جان دے دیتے تھے۔

اور جب جنگ صفین میں خطرے کا احساس ہوا تو ایک مرتبہ پھر اپنے دھوکے اور فریب سے کام لیتے ہوئے قرآن کو نیزے پر بلند کرلیا کہ ہم قرآن کو تسلیم کرتے ہیں۔ علیؑ جانتے تھے کہ اس چال میں کیا پوشیدہ ہے۔ اسی لیے کہا کہ :

"آؤ اپنی جنگ کو جاری رکھو!"

لیکن نادان مقدس حضرات' منافقین کے خطرے سے آگاہ نہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم قرآن سے نہیں لڑیں گے اور اگر تم اصرار کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم قرآن سے جنگ کریں۔ اس طرح اموی نظام کو نجات ملی۔

یہ ہے نفاق کا خطرہ جسے قرآن نے " الا " (خبردار رہیں) کے ساتھ واضح کیا ہے۔ جب بھی اسلام کا سو فیصد کفر سے مقابلہ ہوا اسلام نے اسے شکست دی اور جب اس کا مقابلہ نفاق سے ہوا تو خود شکست کھائی۔ کیونکہ نفاق خود اسلام کی طاقت سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور اسے اسلام کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ یعنی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسی کے خلاف لڑتا ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ نفاق کا خطرہ ہمیشہ اسلام کے لیے موجود رہا ہے لیکن اس کی صورت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہی بلکہ مختلف زمانوں میں اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں۔

ہمارے زمانے میں مادہ پرستوں کا اسلامی لبادے میں پراپیگنڈہ اسی نفاق کی ایک شکل ہے۔ مادہ پرست خدا کا ایک دوسری شکل میں انکار کرتے ہیں اور قیامت کا ایک دوسری صورت میں۔ مثلاً جب قیامت اور آخرت کی بات چل نکلی ہے تو وہ آخرت کو برتر نظام اور دنیا کو پست تر نظام سے یاد کرتے ہیں۔ یعنی وہ قرآن میں دنیا اور آخرت کے تصور کی یہ تشریح کرتے ہیں کہ دنیا کا نظام ظالمانہ اور طاغوتی ہے اور جب یہ نظام بدل جائے گا تو آخرت ہو جائے گی۔

بے شک دنیا میں پست نظام بھی ہے اور پست تر نظام کے خلاف لڑنا چاہیے اور اس کی جگہ ایک اچھے نظام کو نافذ کرنا چاہیے اور یہ بات قرآن کی بعض آیات سے مستفاد ہے۔ لیکن قرآن میں کبھی دنیا اور آخرت سے مراد برتر اور بدتر نظام نہیں ہے بلکہ دنیا و آخرت کا اپنا مفہوم ہے اور پست اور پست تر نظام کا اپنا مفہوم۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مادہ پرست لوگ یہ نہیں کہتے کہ آخرت کا نظریہ باطل ہے اور نہ ہی عالم آخرت میں انسان کے ہمیشہ زندہ رہنے کو جھٹلاتے ہیں بلکہ اس ہمیشگی کی دوسری طرح توجیہ کرتے ہیں۔ جیسے یہ تکامل کی توجیہ کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

"ایک آدمی مرجاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا آدمی بن جاتا ہے۔ جب وہ مرجاتا ہے تو تیسرا آدمی اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہی جاودانی ہے۔"

یہ ہے نفاق کی "تازہ شکل"۔ اور مسلمان چودہ سو سال سے اس سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ جب بھی کوئی دشمن دین جماعت پیدا ہوتی ہے وہ اپنی دین دشمنی کو مذہبی لبادہ اوڑھا دیتی ہے۔ اگر مسلمان خبردار اور ہوشیار رہیں تو وہ ان تمام سازشوں کو بے نقاب کر دیں۔

قرآن منافقوں کے بارے میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ۔"

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سودا کیا اور کیا گھاٹے کا سودا کیا۔ ہدایت کو دیا اور گمراہی خرید لی۔ اس سودے نے انھیں کچھ نفع نہیں دیا۔ بلکہ سراسر نقصان میں رہے۔ یہ اسی طرح گمراہی میں مبتلا ہیں۔"

امام علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ :

" عقل کیا ہے ؟ "

جواب میں فرمایا :

" العقل ما عبد بہ الرحمن
واکتسب بہ الجنان "

" عقل انسان کی رہبری کرتی ہے تاکہ وہ خدا کی
عبادت اور بندگی کرے اور انسان کو ہمیشہ کی
سعادت دیتی ہے "

سائل نے پوچھا کہ :

" معاویہ کے پاس کیا چیز تھی جس سے اس نے
فیصلہ کیا ؟ "

جواب دیا :

" تلك النكرى والشيطنة "

نکری اور شیطنت ، — اور یہ دونوں عقل کی ضد ہیں۔

امامؑ کا مطلب یہ تھا کہ نکری دراصل منافقانہ دھوکے بازی اور جعل سازی ہے اور عقل وہ طاقت ہے جو انسان کو معنویت اور انسانیت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

" مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي ....
.... عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ "

(سورہ بقرہ آیات ۱۷ تا ۲۰)

قرآن مجید نے منافقوں کے مکر و فریب کو غیر مؤثر اور شکست خوردہ

منصوبوں کا نام دے کر ان کے اقدامات کو "مردم فریبی" کی بجائے "خود فریبی" کہا ہے۔ اس کے بعد ان کے مکر و فریب کو بیان کرنے کے لیے دو مثالیں پیش کی ہیں جن سے قرآنی "فلسفۂ تاریخ" کا ایک نہایت اہم نکتہ ہاتھ لگتا ہے جسے اسلامی نظریۂ کائنات اور قرآنی تدبر کا ضروری اصول قرار دیا جا سکتا ہے ہم اس بحث کو نہایت ضروری اور بنیادی سمجھتے ہیں لہٰذا ہم ان آیات کی قدرے تفصیل سے تشریح کریں گے۔

جہانِ انسان اور انسانی معاشرے کے بارے میں شروع سے لے کر کئی قسم کے نظریات پیش کیے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی پیش کیے جاتے رہیں گے خیر و شر کی نظر سے —— اچھائی اور برائی کی نظر سے —— حق و باطل کی نظر سے، یعنی کیا یہ کائنات حق ہے اور نیکی ہے —— یا —— باطل ہے اور شر ہے —— یا —— آدھی حق و خیر ہے اور آدھی باطل و شر۔ یا —— انسانی زندگی پر جو کچھ حاکم ہے وہ حق و خیر ہے یا باطل و شر۔ یا —— آدھا حق و خیر اور آدھا باطل و شر —— اور —— اگر ہم دونوں کے قائل ہیں تو اصالت حق کے ساتھ ہے یا باطل کے ساتھ۔ وغیرہ وغیرہ۔

پہلے ہم انسان کے بارے میں فلاسفہ اور ماہرین علوم عمرانی کے نظریات پیش کریں گے۔ اس کے بعد قرآن کا کائنات کے بارے میں توحیدی نظریہ پیش کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی حد تک انسانی زندگی میں خواہ وہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی خیر و شر، عدل و ظلم، صداقت و کذب، خلوص اور فریب ملے جلے ہوئے ہیں۔ انسانی زندگی کا ایک صفحہ نورانی ہے، ایک صفحہ ظلمانی، نور و ظلمت، عدل و ستم کی یہ ملاوٹ اس قدر گہری ہے کہ روئے زمین پر انسان

کے آنے سے پہلے ہی ملکوتِ اعلیٰ میں اس کا وجود زیر بحث آچکا تھا اور اس کے بارے میں دو قسم کے نظریات پائے جاتے تھے۔

جب خدا فرشتوں سے کہتا ہے:

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً"

"میں زمین پر اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہوں"

تو ملکوتیوں کی طرف سے شور بلند ہوتا ہے۔ یا خدا اس میں کیا حکمت ہے کہ تو ایک فساد کرنے والی اور خون بہانے والی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے۔

"قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ"

فرشتوں نے انسان کو محض شر انگیز، اور خوں ریز مخلوق سمجھا تھا اور اس کی زندگی کے صرف ایک صفحے کو دیکھا تھا۔

اعتراض نہ سہی، فرشتوں نے خدا سے یہ سوال تو کیا کہ ایسی مخلوق کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس چیز کی اپنی جگہ اہمیت ہے کہ انسان ایسی مخلوق ہے کہ فرشتے بھی اس کے وجود کے رازوں کو نہیں سمجھ سکتے اور یہ صرف خدا اور خالق ہے جو اس کے وجود کے اسرار و رموز سے آگاہ ہے۔

لیکن خدا نے فرشتوں کے اس قیاس کو قبول نہ کیا اور نہ اس کی تائید کی بلکہ کہا:

"اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ"

تم اپنے اس بُرے ظن کی وجہ سے غلطی پر ہو۔ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو

تم نہیں جانتے ہو۔

اس کے فوراً بعد جب خدا نے انسان کو پیدا کیا تو ایک آزمائش اور نمائش سے فرشتوں پر ثابت کر دیا کہ وہ سخت غلطی پر ہیں۔

فلاسفہ اور مفکرین بھی ہمیشہ اس مسئلے کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرتے آئے ہیں۔

اکثر مادہ پرست فلاسفہ نے جو نیچر کے بارے میں بُرا گمان رکھتے ہیں اور اصول تخلیق پر بھی یقین نہیں رکھتے بلکہ انسان کو اتفاقات کا نتیجہ سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ شر انسان کی ذات کا حصہ ہے اور پہلے دن جب اس نے زمین پر قدم رکھا تو شرارت کی اور اب بھی وہ شر پھیلانے والی مخلوق ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی رہے گا۔ اس مخلوق سے خیر و برکت کی امید نہیں ہے۔

یہ فلاسفہ معاشرے کے لیے ہر قسم کے اصلاحی منصوبوں کو مسترد کرتے ہیں اور اس کی بہتری کی امید نہیں رکھتے کیونکہ وہ بنیادی طور پر ہی بنی نوع انسان کو اصلاح پذیر نہیں سمجھتے اور انسان کی اصلاح کے طور پر جو کچھ پیش کیا گیا ہے خواہ وہ دین ہو، خواہ فلسفہ اس سے وہ بدظن ہیں اور کہتے ہیں:

"یہ سب ظاہر سازی ہے کیوں کہ اصلاح کے، منصوبے پیش کرنے والے حضرات خود انسان تھے اور ان کے احساسات اور جذبات مختلف تھے اور انسانی جذبات سے شر کے علاوہ کوئی چیز نہیں پھوٹتی۔ لہٰذا اصلاح و اخلاق کا ہر منصوبہ اور تجویز بے ہودہ ہے۔"

جب ان فلاسفہ سے پوچھا جاتا ہے کہ:

"پھر کس امید پر زندہ رہا جائے ؟"

تو کہتے ہیں :

"زندہ تو رہنا ہی نہیں چاہیے !! اگر انسان اپنے کمال پر پہنچ جائے تو اسے خودکشی کو لینی چاہیے !!!"

یہ ہے ایک انسان کی ترقی کی اوج کہ وہ اپنے بارے میں یہ سمجھ لے کہ شر کے سوا کچھ نہیں اور اس کا مستقبل بھی شر ہے اور وہ جتنا عرصہ زندہ رہے گا اس کے شر میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

جب وہ ایسا سمجھے گا تو ان فلاسفہ کی اصطلاح میں وہ فکری بلوغت تک پہنچ گیا ہے اور اسے خودکشی کر لینی چاہیے۔

اس بارے میں متعدد کتب لکھی جا چکی ہیں۔ میں انھیں متعارف نہیں کرانا چاہتا۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ دنیا میں ایسے فلاسفر گزرے ہیں جنھوں نے آخر کار خودکشی کر لی اور یہ سب مادہ پرست تھے اور "بدگمان فلاسفہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ یورپ میں اس مکتب فکر کے اب بھی پیروکار پائے جاتے ہیں اور انھوں نے اس بارے میں کئی مقالات لکھے ہیں۔

ہمارے دور میں ایران میں بھی بعض اہل قلم نے یہ "تلخ زہر" اپنی تحریروں میں گھولا ہے۔ "صادق ہدایت" انہی میں سے ایک ہے۔ ابھی وہ جوان ہی تھا کہ ۱۳۲۰ شمسی ... ایسے افکار سے متاثر ہو کر خودکشی کر لی۔ وہ اپنی تحریروں میں اس بات پر فخر ... "تا تھا کہ فکری بلوغ کے اس مرحلے پر پہنچ گیا ہے جہاں خودکشی کے سوا کوئی دوسرا ... ستہ نہیں ہے۔ وہ کہتا تھا دوسرے لوگوں کو بھی میری پیروی کرنی چاہیے اور ... دکشی کر لینی چاہیے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ ایسے "مفکرین" یہ کہتے ہیں اگر انسان روئے زمین

سے انسان کا بیج ہی ختم کر دے تو یہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہوگی یعنی ایک ہی بم سے انسانی زندگی کو ختم کر دے۔ ظاہر ہے یہ طرز خیال کس قدر غلط اور احمقانہ ہے۔

مادہ پرستوں نے ایک اور فلسفہ بھی پیش کیا ہے۔ اگرچہ وہ بھی بدظنی پر مبنی ہے لیکن وہ اس کا اظہار ایک دوسرے طریقے سے کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں :۔

"انسان کا اپنا کوئی فطری رجحان نہیں ہے۔ بلکہ وہ
اس چیز کا تابع ہے کہ اسے کیا کردار دیا جاتا ہے"

جو لوگ تاریخ اور معاشرے کی مادی ماہیت کے قائل ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو چیز انسانی زندگی پر حاکم مطلق ہے وہ معاشرے کے مادی تعلقات اقتصادی تعلقات اور پیداواری تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات جس شکل میں بھی ہوں انسانی زندگی خیر و شر کے لحاظ سے انہی کے تابع ہے۔

انسانی زندگی کے بارے میں نہ تو خوش فہم رہنا چاہیئے اور نہ بدظن کیونکہ پیداواری تعلقات کبھی انسان کو جبری طور پر اچھا بنا دیتے ہیں اور کبھی جبری طور پر برا۔

کہتے ہیں کہ جب پیداوار اور پیداوار کے آلات کی شرح بہت کم تھی تو انسان اپنی روزمرہ کی ضروریات سے زائد خوراک جمع نہیں کر سکتا تھا۔ انسانی زندگی حیوانوں کی طرح تھی۔ کبوتروں کی طرح جو صبح بھوکے اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور رات تک اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں اور پھر اپنے گھونسلوں کو لوٹ جاتے ہیں اور اگلی صبح پھر یہی کام دہراتے ہیں۔ پہلے زمانے کا انسان بھی ایسے ہی زندگی بسر کیا کرتا تھا اور خوراک کا ذخیرہ نہیں کرتا تھا اور دولت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

معاشرے کے افراد مل جل کر رہتے تھے اور خوراک بھی مل جل کر جمع کرتے تھے۔ مثلاً اکیلا آدمی ایک جانور کو شکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس کافی سامان نہیں ہوتا تھا لہٰذا چند لوگ مل کر کسی بڑے جانور کا شکار کرتے تھے اور اس کا گوشت آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔

ایسے حالات میں انسان مجبوراً برادرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کیونکہ زندگی کے تقاضے ہی ایسے تھے جس طرح مرغ مرغیاں ایک ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ نہ جنگ ہوا کرتی تھی نہ خون بہتا تھا۔

جب آہستہ آہستہ تاریخ میں انسانی تجربات بڑھنے لگے اور زراعت اور مویشی پالنے کا پیشہ چل نکلا تو لوگوں کو حیوانات کے دودھ اور توالد و تناسل سے استفادہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ خوراک کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ اب لوگ بالفرض گندم کا ایک دانہ بوتے تھے تو اس سے بیس گنا پیداوار ہوتی تھی اس طرح ایک شخص دس اشخاص کے برابر پیداوار حاصل کرتا۔

جونہی ایک آدمی اپنے اخراجات سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے لگا تو سابقہ نظام درہم برہم ہو گیا اور نئی صورت حال سامنے آئی۔

سابقہ حالات میں ہر شخص مجبور تھا کہ ہاتھ ہلائے تاکہ اس کا منہ ہل سکے اگر کسی کا ہاتھ نہیں ہل سکتا تھا تو اس کا منہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ لیکن جدید حالات میں جو شخص اپنی ضرورت سے زائد کام کر سکتا، جن میں زیادہ زور ہوتا وہ دوسروں کو غلام بنا لیتے۔ تاکہ غلام کام کریں اور آقا کھائیں۔ یہیں سے مالکیت پیدا ہوئی۔ یعنی زمین کی مالکیت ——— اور ——— انسان پر انسان کی مالکیت۔

پس جب پیداوار اور پیداوار کے آلات کے حالات بدل گئے تو انسانی شرہ بھی دگرگوں ہو گیا اور جس طرح مشترکہ معاشرے میں انسان بھائیوں کی طرح

رہتا تھا اب وہ ایک دوسرے کا دشمن بن کر مقابلہ میں آگیا۔ پہلے والی روشنی اور نیکی غروب ہو گئی اور اس کی جگہ انسانی زندگی پر بالکل اندھیرا چھا گیا۔

بس اسی دن سے انسانیت کی تاریخ میں اندھیرا روشنی پر ——— بدی نیکی پر ——— ظلم، عدل و انصاف پر ——— اور ——— فریب سچائی پر غالب ہے، البتہ اس دوران میں کبھی کبھار روشنی کی ایک کرن چمک اٹھتی اور کبھی کوئی فلسفی یا کسی تحریک کا قائد پیدا ہوتا رہا جو باوے سے تنگ آکر جہل و ظلمت کے خلاف قدم اٹھاتا رہا یا جو لوگ دین سے بہت بدگمان نہ تھے۔ ان کے خیال کے مطابق کوئی پیغمبر آتا رہا اور کچھ دن تک معاشرے میں عدل و خیر کا چرچا رہتا مگر تاریخ پر جو نظام مسلط تھا یعنی مالکیت اور دولت کا نظام۔ اس سے عدل و برکت کا دور جاری نہیں رہ سکتا تھا۔

اس طرح آلات کی صورت میں اصلاح کا منصوبہ دوبارہ ارباب ثروت کے ہاتھ میں چلا جاتا۔ اور مظلوم عوام کے خلاف پھر تانا بانا شروع ہو جاتا۔ یعنی پہلے جو چیز محافظ جان ہوتی تھی بعد میں وہی بلائے جان بن جاتی۔ جو مذہب، فلسفہ و اخلاقی منشور کسی مصلح کی طرف سے پیش کیا گیا اس کا انجام یہی ہوا۔

کہتے ہیں کہ یہ صورت حال ہمیشہ جاری رہتی ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ کسی روز بنیادی حالات یعنی پیداواری تعلقات خود بخود بدل جائیں۔ یعنی ایک زمانہ وہ تھا جب انسان مذکورہ بنیاد میں نقص کے باعث جبراً مشترکہ زندگی بسر کرتا تھا (ابتدائی زمانے میں) لہٰذا اس کے بعد کے زمانے میں بھی جب وہ بنیاد ترقی کر جائے اور پیداوار کے آلات مکمل ہو جائیں تو انسان چاہے یا نہ چاہے اسے مشترکہ زندگی بسر کرنا ہو گی۔

یعنی یہ نوبت آجاتی ہے کہ مشترکہ زندگی کے سوا دوسرا کوئی راستہ باقی نہیں

رہتا اور انسانی خواہش کا اس میں کچھ دخل نہیں ہے کیونکہ پیداوار کے آلات کی ترقی نے جبراً مشترکہ زندگی قائم کی ہوئی ہے۔ جب اس بنیاد میں تبدیلی واقع ہو جائے گی اس دن انسانی معاشرے میں دوبارہ عدل و انصاف اور خیر و برکت اور محبت و اخوت لوٹ آئے گی۔ ان مفکرین کے مطابق وہی مکمل سوشلزم ہے۔

پس فلاسفہ کا یہ گروہ مادہ پرستوں کے پہلے گروہ کی طرح یہ نہیں کہتا کہ انسانی فطرت شر پر ہے بلکہ کہتا ہے کہ انسان کی کوئی فطرت ہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ تو پیداوار کے آلات کے تابع ہے۔ پہلے پیداوار کے آلات ایسے تھے کہ انسان کو جبراً نیک رہنا پڑتا تھا۔ لیکن جب ان آلات کی شکل بدل گئی تو دولت و مالکیت کا تصور سامنے آیا اور انسان بھی برا بن گیا۔

جب تک یہ مالکیت اور دولت ہے اصلاح کا کوئی دروازہ کھلا نہیں ہے اور اگر کوئی انسان یہ کہے کہ وہ اصلاح کرنا چاہتا ہے تو وہ غلطی پر ہے وہ محض اس کا گمان ہے جسے "خیالی سوشلزم" کہتے ہیں۔ حقیقی اصلاح کے لیے اوزار کی ترقی کے نتیجے میں مالکیت کے کالعدم ہونے تک صبر کرنا چاہیے۔ اس دن ہی انسانی معاشرے میں اخوت و انصاف اور خیر و برکت کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔

قرآن کا نظریہ

اب ہم قرآن کی طرف آتے ہیں کہ وہ زیر بحث مسائل پر کیا کہتا ہے؟ تاریخ کی تشریح کے بارے میں یہ قرآن کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

کیا قرآن انسان اور اس کی زندگی کو خوش فہمی سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ شر کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔

کیونکہ قرآن ہمیشہ تاریخ انسانی میں حق و باطل کے درمیان جنگ کا قائل ہے

لہذا وہ باطل کے لیے شخصیت کا بھی قائل ہے۔ یعنی قرآن نور او ظلمت کو ایک دوسرے کے مدمقابل قرار دیتا ہے اور آدم کی تخلیق کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم اسے نقل کر چکے ہیں۔

فرشتوں کے سوال کے بعد وہ گمان کر رہے تھے کہ آدم شر محض ہے۔ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ تم گمان کرتے ہو وہ قطعاً غلط ہے بلکہ کہا:

"میں جو کچھ دیکھتا اور جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔"

یعنی جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ صحیح ہے۔ اور میں بھی دیکھتا ہوں لیکن میں ایسی چیزیں بھی دیکھتا ہوں کہ تم نہیں دیکھتے ہو۔ تم نے صرف ایک طرف کا صفحہ پڑھا ہے اور دوسری طرف سے نہیں پڑھا ہے۔

کیا قرآن کی نظر میں بشر شر محض ہے۔؟

یعنی وہی ناامید اور مایوس کرنے والا نظریہ جو نطشہ اور شوپنہاور کی طرح کے خیالات پر مبنی ہے کہ انسان ناقابل اصلاح مخلوق ہے۔ اور اصولی طور پر اس سے ہمیں غرض نہیں رکھنی چاہیے۔

یقیناً قرآن کا ایسا نظریہ نہیں ہے۔

کیونکہ انبیاء کی بعثت مکمل طور پر انسانی معاشرے کی اصلاح کے لیے تھی اگر انبیاء انسانی فطرت کے بارے میں ایسے ہی بدگمان ہوتے تو اصلاح کے پروگرام نہ پیش کرتے۔ نیز یہ کہ شر کا نظریہ، نظریۂ توحید کے بھی مطابق نہیں ہے جو کہ قرآن کا بنیادی ترین نظریہ ہے۔ یعنی توحیدی نظریہ کائنات نہیں ہو سکتا جو ہستی کو باطل بے فائدہ اور شر قرار دے۔

قرآن مجید سے جیسا کہ محسوس اور مشہود ہے کہ وہ نظام تخلق کو نظام خیر سمجھتا ہے۔ یعنی اس چیز کی تصدیق کرتا ہے کہ دنیا میں خیر بھی موجود ہے اور شر بھی۔

لیکن وہ شر پر خیر کو ترجیح دیتا ہے اور باطل پر حق کی ترجیح کا قائل ہے۔ اسلامی نظریۂ کائنات اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔

پس قرآن کیا کہتا ہے ؟

قرآن کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟

قرآن کا نظریہ مارکس ازم کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن کہتا ہے تاریخ میں ہمیشہ حق و باطل موجود رہے ہیں اور یہ تنازعہ انسانی فطرت کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ انسان کی دو فطرتیں اور دو سرشتیں ہیں یہ ایک ایسی مخلوق ہے جسے ہماری روایات کے مطابق خدا نے عقل و شر سے مرکب کیا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ :

تاریخ میں اس تنازعہ میں ——

غلبہ خیر ہی نے پایا ہے —— عدل اور روشنی کی بقا رہی ہے —— اور —— ظلمت اور بدی وقتی ہیں۔

قرآن نے مارکس کی طرح مالکیت کو معیار قرار نہیں دیا بلکہ ایمان کے لیے روحانی سرمائے کو اصل معیار قرار دیا ہے۔ یعنی قرآن یہ نہیں کہتا کہ دین، مذہب اور اخلاق ہمیشہ دولت کا بازیچہ ہیں۔

کبھی کبھار طاقت اور دولت مذہب پر اثر انداز ہوتی ہے اور بدعت اور تحریف پیدا کر دیتی ہے لیکن زیادہ تر مذہب ہی ایک مضبوط اور طاقت ور عامل کی حیثیت سے انسانی سرنوشت میں مؤثر رہا ہے۔

اصالت حق ہی کی ہے

قرآن مجید کی نظر سے شر اور باطل کی اصالت نہیں ہے بلکہ یہ حق کے طفیل

سے پیدا ہونے والی ایک چیز ہے۔ جیسے سایہ اور نور، اندھیرا اور روشنی جو دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ ہیں لیکن نور کے مقابلے میں ظلمت کی کوئی اصالت نہیں ہے یعنی ہمارے سامنے دو واقعیتیں نہیں ہو سکتی ہیں جو دو مختلف ماخذ سے پھوٹتی ہوں۔ ایک نور ہو اور دوسرا اندھیرا۔

اصل تو نور ہی ہے۔ جہاں نور نہیں وہاں اندھیرا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جہاں نور نہ ہو وہاں نور کی مخالف اندھیرے کے علاوہ کوئی چیز ہو، اندھیرا نور نہ ہونے کا ہی نام ہے۔

یا صحت اور بیماری کی مثال لے لیں۔

اگر انسانی جسم کو صحت مند رکھنا درکار ہو تو اس میں توازن برقرار رکھنا ضروری ہے۔ حیاتین کی معین مقدار میں کمی یا بیشی سے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اور بیماری صحت نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کا اصل جسم اصلی چیز وہی توازن اور صحت ہے۔ اگر مزاج میں عدم توازن کی وجہ سے کوئی مرض لاحق ہو تو پھر بھی خواہ ناخواہ اپنی ابتدائی اصل حالت یعنی صحت کی طرف لوٹ جائے گا۔

جس طرح ایک بدن کو توازن اور صحت کی ضرورت ہے اسی طرح ایک انسانی معاشرے کو سچائی ——— امانت ——— ایمان ——— اور ——— عفت کی ضرورت ہے اور معاشرہ ان چیزوں سے خالی نہیں رہ سکتا اور اگر ان سے خالی ہو جائے تو ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر چند روز ظلم و ستم، بے امنی اور بے غیرتی کو غلبہ بھی حاصل ہو جائے تو چونکہ نیکی اور نور اصلی ہیں اور ظلمت اور شر دفتی ہیں۔ لہٰذا یہ جلد ہی اپنی پہلی فطرت کی طرف لوٹ جائیں گے۔

قرآن مجید کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے :

① ــــــ دنیا میں باطل کی اصالت نہیں ہے بلکہ یہ حق کی طفیلی پیداوار ہے۔

② ــــــ چونکہ باطل طفیلی ہے لہٰذا اسے دوام بھی حاصل نہیں۔ دوام صرف حق کو حاصل ہے۔

③ ــــــ اگرچہ باطل کی نہ اصالت ہے نہ اسے دوام حاصل ہے پھر بھی ظاہری طور پر اس کی ایک وسعت ہے۔ اگر آنکھ حقیقت بین نہ ہو تو انسان باطل کی اصالت کا قائل ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ حق باطل کے مقابلے میں چھوٹی چیز ہے۔

یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ باوجود اس کے کہ باطل ایک طفیلی امر اور غیر اصیل ہے اور اسی وجہ سے وہ "جھاگ" کی طرح فنا ہو جاتا ہے لیکن جب ظاہر ہوتا ہے تو اس کا پھیلاؤ اتنا زیادہ اور نمایاں ہوتا ہے کہ اگر انسان گہری نظر سے نہ دیکھے تو پوچھ بیٹھتا ہے کہ :

" حق کہاں ہے ؟ جو کچھ ہے یہی باطل ہے ۔"

اور یہی وہ غلطی ہے جس کا ارتکاب اکثر لوگ کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی نظر میں گہرائی نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ :

" اگر دنیا میں کسی کا ظہور ہوا بھی ہے تو وہ بجلی کی طرح تھا جو چمکی اور غائب ہو گئی۔ اس کے علاوہ دنیا میں جس کا غلبہ ہے وہ باطل ہے۔"

یہ لوگ اس چیز کو بھلا بیٹھے ہیں کہ اصالت تو حق کی ہے اور باطل نے

اپنی قوت حق سے لی ہے اور اسی کے طفیل ہے لیکن اس نے حق کو چھپایا ہوا ہے۔

قرآن مجید نے حق و باطل کی کشمکش کا احوال کئی آیات میں بتایا ہے اور اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔

سورۂ رعد آیہ ۱۷ میں ہے:

"اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ....

... یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ":

"خدا اوپر سے پانی بھیجتا ہے (بعض مفسرین کہتے ہیں پانی یعنی پاک اور صاف پانی) بارش کا یہ پاک اور صاف پانی چوٹیوں پر پہاڑوں پر گرتا ہے اور پھر وادیوں، دروں، دریاؤں میں بہتا ہے اور اپنے راستے میں کثافتوں کو ساتھ بہائے جاتا ہے پانی آہستہ آہستہ سیلاب بنتا جاتا ہے۔ پانی کے اجزاء کے پتھروں سے ٹکرانے اور کثافتوں کے اٹھانے سے جھاگ پیدا ہوتا ہے۔"

ایسا جھاگ کہ اگر کسی کو پتہ نہ ہو تو جب اس عظیم دریا پر نظر دوڑاتا ہے تو سمجھتا ہے جو کچھ ہے یہی جھاگ ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ جو کچھ ہے پانی ہے یعنی بنیاد پانی ہے اور یہ پانی ہے جس نے قوت و حرکت پیدا کی اور جھاگ کو بنایا ہے اور جھاگ کا وجود پانی کے طفیل ہے لیکن یہ اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ پانی کو بھی چھپا لیا ہے۔

اس کے بعد آیت میں فرمایا گیا ہے:

"وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ

ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ۔"

"یعنی اس کی مثال دھاتوں کے پگھلانے کی سی ہے۔ جب کسی دھات کو زیور بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں تو اس کے اوپر جھاگ سا ظاہر ہونے لگتا ہے۔

"كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ"

"یہی مثال حق و باطل کی ہے۔"

اور بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حق کا وجود صاف اور پاک پانی اور قیمتی دھات کی مانند ہے اور باطل پانی کے اوپر جھاگ کی طرح ہے۔

"فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ"

"زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ جھاگ بیٹھ جاتا ہے۔ زائل ہوجاتا ہے، فنا ہوجاتا ہے۔

"وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۚ"

"اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہے یعنی حق، وہ باقی رہتی ہے۔"

دریاؤں میں جھاگ کے نیچے جو پانی بہہ رہا ہے کھیتوں میں جاتا ہے۔ زمینوں کو سیراب کرتا ہے اور اچھے پھل پیدا کرتا ہے، قیمتی دھات باقی رہ جاتی ہے اور زیور کی صورت میں ڈھل جاتی ہے اور اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

سورۂ ابراہیم آیات ۲۴ - ۲۶ میں ہے:

"اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

كَلِمَةً طَيِّبَةً ...... مِنْ قَرَارٍ ۝

قرآن میں لفظ " کلمہ " کبھی " لفظ " کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی حقائق کے مفہوم میں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کے بارے میں فرمایا گیا:

" کَلِمَةُ اللّٰه "

زیرِ بحث آیت میں حق عقیدہ اور باطل عقیدہ کو کلمہ قرار دیا گیا ہے۔
اور ہر ایک کے لیے ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ یعنی:

کلمۂ حق ایک میوہ دار تندرست درخت کی مانند
ہے جس کی جڑیں زمین میں ہیں اور اس کی شاخیں
پھوٹی ہوئی ہیں اور وہ میوہ دار ہے۔ اس کا
پھل فصلی نہیں ہے بلکہ ایسا درخت ہے کہ جس کا
جتنا پھل چنا جائے پھر بھی اس پر پھل لگا رہتا ہے
لیکن باطل عقیدہ ایک پلید درخت کی طرح ہے
جس کی نہ جڑ ہوتی ہے نہ اس پر پھل لگتا ہے۔

کبھی کبھار بعض زمینوں میں ایسے پودے اگتے ہیں جن پر کوئی پھل نہیں لگتا۔ جب ہم ان پودوں کو بغور دیکھتے ہیں تو ان کی جڑیں زمین میں نہیں ہوتیں جونہی کوئی معمولی ہوا چلی وہ اپنی جگہ سے اُکھڑ کر دور جا گرے۔ بالکل اُس جھاگ کی طرح جس کی مثال سابقہ آیت میں دی گئی ہے۔ یعنی اس کی نمود تو بڑی ہے لیکن اندر سے کچھ نہیں۔

ناصر خسرو نے ایک مکالمہ نقل کیا ہے:

کدو کی بیل چنار کے درخت کے نیچے سے اُگی اور بڑی تیزی سے چنار کے سارے درخت پر پھیل گئی اور چنار کا درخت تیس سال میں اتنا بڑا ہوا تھا۔

مگر کدو کی بیل بیس دن کے اندر ہی چنار کے درخت پر چڑھ گئی اور چنار سے پوچھا کہ :

"تمھاری عمر کتنے روز ہے ؟ "

چنار نے جواب دیا :

"میری عمر تیس سال سے زائد ہے ۔"

کدو نے ہنس کر طعنہ مارا :

"مجھے دیکھو میں نے بیس دن کا ہو کر تم سے زیادہ نشوونما کی ہے ۔"

چنار نے جواب دیا :

"بگذار بر من و تو وزد باد مہرگان
آنگہ شود پدید کہ نامرد و مرد کیست!
ذرا ہم پر خزاں کی ہوا چلنے دو پھر پتہ چلے گا کہ کون مرد ہے اور کون نامرد ۔ اس کے آگے کون ٹھہرتا ہے ۔"

الغرض قرآن مجید کہتا ہے کہ ظاہر بین مت بنو اور باطل کی نمود و نمائش گو زیادہ ہے لیکن وہ تمھیں فریب نہ دے بلکہ تمھیں گہری نظر سے دیکھنا چاہیے ممکن ہے کوئی ایسا مسلک جس کی عمر بیس تیس سال ہے اچانک ایسا پھیل جائے کہ بظاہر مسلکِ حق سے جس کی عمر چودہ سو سال ہے اس کی نمود و نمائش زیادہ ہو ۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ صبر کرنا چاہیے اور بادِ مخالف کا انتظار کرنا چاہیے اسلامی انقلاب کو چودہ سو سال ہو چکے ہیں ۔ کیا کیا تند و تیز اور مخالف آندھیاں چلیں مگر یہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں ۔ لیکن ایسے مکاتب و مسالک جو بہت جلد

نشیب و فراز طے کر لیتے ہیں وہ ایسی آندھیوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔

سورۂ انبیاء آیہ ۱۸ میں فرمایا گیا ہے:

" بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ "

اس سے پہلے کی آیات اصولِ تخلیق سے متعلق ہیں۔ یعنی اس مادی نظریے کے خلاف جہاد کرتی ہیں جس میں دنیا کو فضول قرار دیا گیا ہے۔ انسان کی زندگی اور انسانی معاشرہ اصول تخلیق کے تابع ہیں۔ اگر اصول تخلیق کی بنیاد لہو و لعب پر ہوتی تو انسان جو کہ ایک مخلوق ہے اس کا وجود اور معاشرہ بھی فضول اور ہیچ ہوتا۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ:

" وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ "

" ہم نے اس جہان کو اس عظمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ہم بازی گر نہیں تھے اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ بچوں کی طرح جو تفریح کے لیے کھیلتے ہیں بازیچہ بناتے ہیں اور مٹا دیتے ہیں۔ کا کوئی کام کریں ..... "

اس کے بعد فرمایا:

" بَلْ نَقْذِفُ بِالحق .... "

یہ آیت گویا اس سوال کا جواب ہے جس میں یہ کہا جائے کہ اگر دنیا کی بنیاد لہو و لعب پر نہیں ہے تو انسانی معاشرے میں یہ جو باطل پایا جاتا ہے۔

یہ کیا ہے۔ کیا دنیا میں جھوٹ اور خیانت نہیں ہے ؟

کیا ظلم و تعدی اور خونریزی اور فساد نہیں ہے ؟

پس دنیا میں جو باطل عقائد اور مسلک ہیں۔ کیوں ہیں ؟

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے یہ سب طفیلی چیزیں ہیں۔ یعنی جب حق ظاہر ہوتا ہے تو ضرورت کے طور پر حق کے وجود کے طفیل یہ بھی پیدا ہو جاتی ہیں لیکن انھیں دوام حاصل نہیں ہے اور جلد ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

" قذف " کسی چیز کو قوت کے ساتھ پھینکنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً پتھر اٹھا کر شیشے کو مارنا۔ قرآن کہتا ہے :

" بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ ۔"

گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ ہم حق سے ایک گولی بنائیں گے اور اس سے باطل کو ماریں گے اور اسے تہس نہس کر دیں گے۔ جب تم باطل کو ڈھونڈنے نکلو گے تو دیکھو گے کہ باطل کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا اور اسے ختم ہی ہونا تھا۔

" فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ "

ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلے زاہق (مٹنے والا) نہ تھا اور اب ایسا ہو گیا ہے نہیں ۔ بلکہ جب تک حق اس سے لڑنے نہیں آیا تھا۔ وہ اہم دکھائی دیتا تھا مگر جونہی حق نے اس کی خبر لی اس کا باطن معلوم ہو گیا کہ اصل میں یہ کچھ نہیں تھا۔ بلکہ ایک غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا اور اب خالی ہو گیا ہے۔

سورۂ اسرا آیہ ۸۱ میں فرمایا گیا :

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ،

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔"

کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا ..... "

آپ یہ نہ سمجھیں کہ پہلے باطل کی کوئی حیثیت اور واقعیت تھی اور اب جو حق آیا تو اس کی جگہ لے لی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ :

" اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا "

" باطل تو مٹنے والی چیز تھی "

یعنی یہ محض ایک جسم تھا اور نمود و نمائش۔ یہ کوئی حقیقت نہیں تھا۔

یعنی قرآن کی نگاہ سے حق و باطل کی جنگ ایک ہستی کی دوسری ہستی کے خلاف جنگ نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ہستی کی نیستی کے ساتھ جنگ ہے نقص کی کمال کے ساتھ جنگ ہے۔ چونکہ تمام باطل نقص کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں ظالم اگر ظالم ہے تو اپنے نقص کی وجہ سے ہے۔ کمال کی وجہ سے نہیں۔ یعنی جہالت اور احساس کمتری کی وجہ سے ہے جو اس طرح اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔

مختصراً یہ کہ قرآن مجید اگرچہ حق و باطل کی جنگ کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی وہ باطل کی اصالت کا قائل نہیں ہے۔

مادہ پرستوں کے نظریات کے برعکس جو اصولی طور پہ انسان کو بذاتہ شر کی مخلوق سمجھتے ہیں یا انسان کے لیے کسی فطرت کے قائل نہیں ہیں اور اسے پیداوار کے آلات کی تبدیلیوں کے تابع سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے مادہ پرستوں کا کوئی مدینہ فاضلہ بھی نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے اور اگر وہ اس کا دم بھی بھریں تو یہ ان کے مکتب فکر کے خلاف ہے۔ کیونکہ " مدینہ فاضلہ " کی تجویز جو کہ ایک اسلامی تجویز ہے۔ وہ شخص پیش کر سکتا ہے جو انسان کو قابل اصلاح سمجھے

قرآن مجید اقوام کی سرنوشت اور تمدنوں کی تاریخ کا ذکر کرتا ہے اور انھیں نقل کر کے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ ہر ایسا معاشرہ جس میں شر غالب ہو اور باطل کی حکومت ہو وہ معاشرہ فنا ہو کر رہے گا اور جس معاشرہ

ہیں حق کی حکومت ہے وہ باقی رہے گا۔ اس بات کے کئی شواہد ہیں جن کا قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ کتنے ہی معاشرے تھے جن پر خدا کا عذاب ہوا کیونکہ وہ حق کے راستے سے منحرف ہوئے اور باطل کی طرف رُخ کیا۔

ممکن ہے انسان تاریخ کا مطالعہ کرے اور جرائم پیشہ لوگوں کو ہی پائے اور کہے کہ :

"تمام تاریخ محض ظلمت ہے!"

لیکن یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ تاریخ کو شخصیات نے بنایا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ پانی کے اوپر جھاگ ہے اور زائل ہو جائے گا۔

جب ہم تاریخ اسلام پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہارون الرشید کو دیکھتے ہیں وہ الف لیلہ کا ہیرو ـــــــ اس کے بڑے بڑے قید خانے ـــــــ اس کی بادہ نوشی ـــــــ اس کے مظالم ـــــــ تو کہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ کا نمونہ ہارون ہے۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے ـــــــ ہارون فانی ہے ـــــــ اسے دوام اور بقا حاصل نہیں ہے۔ وہ لوگ جو اصل زندگی کو چلاتے ہیں۔ یعنی زراعت کرتے ہیں، پیداوار بڑھاتے ہیں ـــ یعنی عوام الناس جو کام کرتے ہیں، معیشت کا پہیہ گھماتے ہیں وہ آپ کو نظر نہیں آتے۔ لیکن ان کی مثال جھاگ کے نیچے پانی کی سی ہے۔ اور ہارون قسم کے لوگ ان کے وجود کے طفیل زندگی بسر کرتے ہیں اور تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ اس قسم کے ہارونوں کے خلاف جدوجہد کرو اور مایوس نہ ہو اور یہ نہ کہو کہ ہمیشہ ہارون ہی معاشرے کو چلاتے رہے ہیں۔

نہیں!

بلکہ موسیٰ بن جعفرؑ باقی رہتا ہے جو ہارون کے محل کے پاس قید خانے میں محل کے اندر کی مستیوں کی آواز سنتا ہے۔ اگرچہ ابھی کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ لوگوں کے دلوں میں ہزاروں انسانوں پر ایک قوتِ حاکمہ کی طرح رہ رہا ہے۔ موسیٰ بن جعفرؑ کے افکار ابدی ہو جائیں گے اور ہارون کی سطوت و عظمت اور رعب و دبدبہ ختم ہو جائے گا۔

ان مقدمات کے بعد جو قدرے طویل ہو گئے ہیں زیرِ بحث دونوں مثالوں پر گفتگو کرتے ہیں:

"مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا .... لَا يُبْصِرُونَ"

ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس بیابان میں روشنی کا کوئی انتظام نہ ہو وہ آگ جلاتے ہیں کہ اس آگ کی روشنی سے استفادہ کریں۔ اچانک آندھی آتی ہے اور تمام آگ کو ایک جگہ بجھا کر رکھ دیتی ہے اور ان لوگوں کو دوبارہ اندھیرے میں ڈال دیتی ہے۔

اس آگ اور اس کی روشنی سے مراد باطل اور مختلف ٹولوں کی مکارانہ چالیں ہیں۔ نورِ حق مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مفسروں نے کہا ہے۔

اس بات کی وضاحت یوں ہے کہ انسان کو چند قسم کی ہدایت ہے۔ ایک جبلی ہدایت جو انسان میں کم ہے لیکن حیوان میں زیادہ ہے۔ ایک حسی ہدایت جس کے ذریعے انسان معرفت حاصل کرتا ہے۔ آنکھ کے ذریعے، کان کے ذریعے، ایک عقل و فکر کی ہدایت ہے۔ یہ سلسلہ "وحی" کی ہدایت پر منتہی ہوتا ہے اور

انبیاء کے پیروکاروں کے بھی ہدایت شاملِ حال ہے۔

پس انسانی فکر جو بھی ہو انسان کے لیے نور ہے اور روشنی عطا کرتی ہے البتہ کبھی انسان اس روشنی کو نظامِ تخلیق کے مطابق اسی راستے پر استعمال کرتا ہے جو خدا نے متعین کیا ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

"ہم ہر مخلوق کو اپنے راستے کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ جو لوگ ہماری ہدایت کے راستے میں قدم اٹھاتے ہیں ہم ان کو مزید ہدایت دیتے ہیں۔"

(سورۂ محمد آیت ۱۷)

لیکن کبھی کوئی راہ ہدایت کو چھوڑ کر اپنی سوچ کو گمراہی کے راستے پر استعمال کرتا ہے یعنی اپنی عقل و تدبر سے منصوبے بناتا ہے اور سب منصوبے خدا کے راستے کے برخلاف ہیں۔ یہ منصوبے ایسے ہیں کہ انسان کو تھوڑا سا آگے لے جاتے ہیں اور وہ چند قدم اٹھا بھی لیتا ہے لیکن اسے دوام نہیں ہے اور جلد ہی یہ منصوبے ملیامیٹ ہو جاتے ہیں قرآن کہتا ہے کہ:

"ان کی مثال ایسے آدمی کی مثال ہے جو ایک اندھیرے جنگل میں اپنے ہاتھ سے آگ جلاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس تھوڑی سی آگ سے وہ جنگل روشن ہو جائے لیکن نہ صرف یہ کہ اس آگ کی روشنی زیادہ نہیں ہوتی اور وہ صرف اس شخص کے اردگرد کی جگہ کو چمکاتی ہے بلکہ اس آگ کو دوام بھی حاصل نہیں اور یہ جلد ہی بجھ جاتی ہے۔"

یعنی چونکہ باطل کا تکیہ فریب اور مکاری پر مبنی ہے اس لیے وہ فانی ہے۔
یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن ان لوگوں کے برعکس جو یہ کہتے ہیں کہ
تاریخ میں حق کی مثال ہمیشہ بجلی کی طرح رہی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے چمکی اور
غائب ہوگئی یہ کہتا ہے:

"باطل وہ بجلی ہے جو ایک لمحے کے لیے چمکی اور بجھ گئی"۔

اور قرآن کے الفاظ ہیں:

"جونہی اس بجلی سے انسان کے اردگرد کی جگہ چمکتی
ہے انسان خیال کرتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے"۔

"ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ"

تبدیل نہ ہونے والی سنت کی بنیاد پر خدا کے پاس جو وسائل ہیں،
ان کے ذریعے وہ ان لوگوں سے روشنی لے لیتا ہے۔

"وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ"

"اور انھیں تاریکیوں میں دھکیل دیتا ہے"

"صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ ......"

نہ صرف یہ کہ ان کی آنکھیں نہیں دیکھتی ہیں
بلکہ ان کے کان بھی نہیں سنتے۔

اگر انسان کسی جنگل میں ہو اور وہ آنکھ سے نہ دیکھ سکتا ہو لیکن کان سے
سن سکتا ہو تو وہ کسی گاڑی کے ہارن یا اونٹ کی گھنٹیوں یا انسان کے قدموں
کی چاپ سے راستہ تلاش کر سکتا ہے اور اگر وہ بولنے کی قوت بھی رکھتا ہے تو
دوسروں کو آواز دے کر راستہ پا سکتا ہے۔

لیکن یہ لوگ ایسے ہیں جن کی نہ آنکھیں دیکھتی ہیں نہ کان سنتے ہیں نہ

دوسروں کی آواز سُن سکتے ہیں۔ ان کی زبان بھی گونگی ہے جو نہ پکار سکتی ہے نہ دوسروں سے مدد مانگ سکتی ہے۔

"فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ":

اب ان کی واپسی نہیں ہے (یہ جہاں ہیں وہیں دفن ہونے چاہئیں)"

آپ دیکھیے قرآن کس طرح تاریخ کے بارے میں رجائیت کا نظریہ رکھتا ہے اور ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اگر حق جد وجہد کرے تو آخر کار غالب اور فتح مند ہے اور باطل شکست کھائے گا۔

یہ ایک مثال تھی اس روشنی اور نور کے لیے جو یہ لوگ خود پیدا کرتے ہیں یعنی یہ لوگ جو منصوبے بناتے ہیں وہ کچھ عرصے کے لیے ان کے لیے کار آمد ہوتے ہیں۔

لیکن کبھی یہ لوگ اس روشنی سے استفادہ کرتے ہیں جو انھوں نے خود نہیں جلائی ہوتی بلکہ کسی دوسرے مقصد کے لیے بجلی چمکی ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے تو یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ فوراً بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اس روشنی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ غائب ہو چکی ہوتی ہے۔

"اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ......"

"یا ان کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرا ہو اور زور سے بارش برس رہی ہو........"

یہاں کئی اندھیرے مقصود ہیں:

بارش برستی ہے یہ ایک اندھیرا ہے۔

بارش کے ساتھ ظاہر ہے بادل بھی ہے یہ دوسرا اندھیرا ہے۔
چونکہ رات کا سماں ہے یہ تیسرا اندھیرا ہے۔
کیونکہ اگر صرف رات ہوتی اور بارش اور بادل نہ ہوتے تو انسان ستاروں کی روشنی سے کام چلا سکتا تھا اور اگر ابر ہوتا اور بارش نہ ہوتی تب بھی ہوا میں کچھ روشنی ہوتی اور اگر یہ سب کچھ ہوتا لیکن رات نہ ہوتی بلکہ دن ہوتا تو انسان بادلوں کے پیچھے چھپے سورج کی روشنی سے استفادہ کر سکتا تھا اور راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے:

"فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ "۔

" يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ
مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ "۔

" بادل کی کڑک انھیں اس قدر خوفزدہ کرتی ہے
کہ وہ موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں کانوں
میں ٹھونس لیتے ہیں تاکہ وہ آواز نہ سُن سکیں"۔

" وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ "۔

" حالانکہ خدا کافروں کو (اس طرح) گھیرے
ہوئے ہے (کہ اُسک نہیں سکتے)۔

" يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ "۔

" بجلی اتنی شدت سے چمکتی ہے گویا ان کی آنکھوں
کو چندھیا دے گی"۔

" كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ "۔

طرح طرح کی تاریکیوں میں جونہی بجلی چمکتی ہے وہ بجلی کی روشنی سے استفادہ کرتے ہیں اور ایک قدم اٹھاتے ہیں لیکن ان کے لیے دوام نہیں ہے کیونکہ بجلی جلد ہی بجھ جاتی ہے اور وہ لوگ ایک قدم سے زیادہ نہیں چل سکتے۔

"وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا"۔

"جب اندھیرا ہوجاتا ہے تو اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں"۔

"وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ"۔

"اگر خدا چاہے تو پہلے کی طرح نہ صرف انھیں تاریکی میں بھٹکائے گا بلکہ ان کے کان اور آنکھیں بھی ان سے لے لے گا"۔

یہ ہے تاریخ کے مکاروں اور چالبازوں کا انجام۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کی اصالت پر نہ جائیں اور ان سے نہ ڈریں اور یہ نہ سمجھیں کہ غلبہ ان لوگوں کو حاصل ہے۔ ان لوگوں کا زوال یقینی ہے اور دوام اور بقا حق کو حاصل ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ کسی ایسے عہد کا انتظار کرنے بیٹھ جائیں جب مالکیت ختم ہو اور پیداوار کے آلات جبراً اشتراکیت پیدا کر دیں۔

جہاں اشتراکی نظام ہے وہاں زیادہ تاریکی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ پیداوار کے آلات کی تکمیل سے بھی کام نہیں بنا۔ یہ انسان ہے جو عدل اور روشنی لا سکتا ہے اور اس کے سائے میں سعادتمندانہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔

"إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"۔

"خدا ہر چیز پر قادر ہے"۔

"یَاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ ......

.... اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (آیات ۲۱ - ۲۲)

یَاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ ....

یہ دو آیات جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور دوسری آیت پہلی آیت کو مکمل کرتی ہے۔ توحید کی دعوت ہے۔ یعنی اسلام کا بنیادی ترین اصول اور الٰہی تعلیمات کی فکری اور اعتقادی بنیاد ہے۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا پہلی آیت میں "یَاَیُّهَا النَّاس" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے "ناس" کا لفظ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ چاہے وہ بطور خطاب ہے جیسے یہاں ہے چاہے کسی دوسرے طور پر جیسے:

لِلّٰه علی الناس حج البیت من

استطاع ...."

"ناس" اور "انسان" کا ماخذ ایک ہی ہے اور ان دونوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ صرف ادبی نقطہ نظر سے فرق ہے۔ کہتے ہیں انسان اسم جنس ہے لیکن ناس اسم جمع ہے۔ یعنی جب ہم کہتے ہیں انسان تو اس کا مطلب بنی نوع انسان ہے لیکن جب ناس کہا جاتا ہے تو یہ انسانوں کی جمع ہے جیسے لفظ "قوم" جو عوام کی جمع کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

پس "یَاَیُّهَا النَّاس" یعنی اے انسانوں کے گروہ، اے انسانی معاشرے، اے دنیا بھر کے لوگو!

اب اس بارے میں وضاحت طلب بات یہ رہ گئی ہے کہ:

ہر مکتب میں چار چیزیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

○ —— اس مکتب کا روئے سخن کس قسم کے لوگوں کی طرف ہے۔ یعنی

وہ مکتب کس قسم کے لوگوں کے لیے آیا ہے۔ کیا تمام لوگوں کے لیے ہے یا کسی خاص گروہ کے لیے ہے اور اگر خاص گروہ کے لیے ہے تو وہ کون لوگ ہیں؟

(۲) ——— اس مکتب کا مقصد کیا ہے؟

(۳) ——— وہ مکتب کائنات کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ یعنی دنیا، انسان اور زندگی کے بارے میں کس قسم کے نظریے پر استوار ہے؟

(۴) ——— اس مکتب کی تعلیم کیا ہے۔ یعنی اس کے احکام اور راہنما اصول؟

یہ چاروں چیزیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ یعنی نظریہ کائنات کیا ہو۔ اس کا تعلق اس امر سے ہے کہ اس کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ اس کے برعکس مخاطب کون ہیں اس کا تعلق نظریہ کائنات کی نوعیت سے ہے۔ آخر کار ان سب کا تعلق اس امر سے ہے کہ مقصد کیا ہے اور اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ اس مکتب کے احکامات کیا ہیں اور اپنے مخاطبین کے لیے کیا پیغام ہے۔

زیر بحث آیت میں بھی مسئلہ مخاطبین اور پیغام کا ہے توحید کا پیغام جو اسلام اور قرآن کا بنیادی زریں پیغام ہے۔

قرآن کے مخاطبین

مخاطبین کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ مکاتب و مسالک خواہ وہ الٰہی ہوں خواہ خود ساختہ، ان کے مخاطبین ہوتے ہیں اور ان میں باہمی فرق بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ممکن ہے ایک مکتب پر قومیت کا رنگ چڑھا ہو جیسا کہ اکثر پارٹیاں

قومیت کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہیں اور ان کا مقصد (کم از کم اپنے دعوے کے مطابق) اپنی قوم کو آزادی اور خوشحالی دلانا ہوتا ہے ۔ اس بنا پر ان کا مخاطب ان کی قوم ہوتی ہے ۔ مثلاً جب انگلستان میں لیبر پارٹی بنتی ہے تو اس کا مخاطب بھی انگریز قوم ہوتی ہے ۔

ممکن ہے کوئی مکتب نسل اور خون کی بنیاد پر قائم ہوا ہو تو اس کا مقصد بھی ایک نسل کی بھلائی ہے اور خود بخود اس کا روئے سخن اسی قوم کی طرف ہوگا۔ مثلاً سیاہ فاموں کی سفید فاموں کے خلاف تحریکیں ۔ ان تحریکوں کا خطاب صرف سیاہ فاموں سے ہوتا ہے ۔

مثلاً مارکسزم کا دعویٰ ہے کہ وہ محنت کشوں کی بھلائی کے لیے معرض وجود میں آیا ہے ۔ لہٰذا اس کے مخاطبین صرف محنت کش اور مزدور ہیں اور سرمایہ داروں کو اس مکتب کی رکنیت نہیں دی جاتی ۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ مکتب اسلام کی دعوت کا مخاطب کون ہے اور یہ کن لوگوں کی رکنیت قبول کرتا ہے ؟

کیا اسلام اس لیے عربوں میں ظاہر ہوا تھا کہ اس کے مخاطب صرف عرب ہیں ؟ یا چونکہ یہ مکتب مکہ میں ظہور پذیر ہوا ہے تو کیا اس کے مخاطب صرف اہلِ مکہ ہیں ۔

جب ہم قرآن کے مخاطبین پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں کہیں "اے عرب ! ـــــ اے قریش ، ـــــ اے اہلِ مکہ ! اے اہلِ مدینہ ، اے اہلِ شام " نہیں آیا ۔ بلکہ قرآن میں دو قسم کے خطاب ہیں ۔ ایک زبانی دعوت کے وقت خطاب ہے ۔

" یَاَیُّھَا النَّاس "

یعنی اے تمام انسانو!

اور دوسرا خطاب ان کو ہے جنھوں نے دعوت قبول کر لی ہے ایسے لوگوں کو "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہا گیا ہے۔

یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اصولی طور پر ساری انسانیت کو مخاطب ہونا صحیح ہے اور عملی بھی ہے یا نہیں؟

بعض لوگ کہتے ہیں چونکہ انسان فلسفہ کی اصطلاح کے مطابق ایک "انتزاعی" مخلوق ہے لہٰذا وہ کسی ایک مکتب کا مخاطب نہیں بن سکتا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان چونکہ انسان ہے لہٰذا اس کا کوئی وجدان نہیں ہے اگر کوئی مکتب اپنا مخاطب انسان کو قرار دیتا ہے تو وہ مکتب کوئی تحریک نہیں چلا سکتا۔

ممکن ہے ایرانی، عربی یا عجمی کو خطاب کیا جائے اور ان کا قومی وجدان ان کی تحریک کا سبب بن سکے۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ اے ایرانی، اے مصری، اے عرب تجھے ایسا ہونا چاہیے۔

اس خطاب میں قومی غرور پر تکیہ کیا گیا ہے۔ یا کسی کے نسلی تفاخر پر انگلی رکھی جا سکتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اے سیاہ فامو! سرخ فامو! یا کسی طبقے کو مخاطب کیا جا سکتا ہے کیونکہ طبقاتی وجدان بھی ہوتا ہے۔

یعنی اے سرمایہ دارو! اے محنت کشو! اے کسانو!

یعنی اس خطاب میں جس تار کو چھیڑا گیا ہے اسی کے ذریعہ تحرک پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ تار وہی طبقاتی وجدان ہے۔ ایک محنت کش سے جو خطاب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اے مزدور! تمھارا مال و دولت کیوں کم ہو۔؟

تو اس کو متحرک کرنے کا محرک اس کا مفاد ہے ۔ وہ محنت کش اپنے تئیں سوچتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا حق کوئی دوسرا آدمی کیوں لے ۔ آپ نے اس کے اسی احساس سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ لہٰذا کوئی مکتب پوچھ سکتا ہے کہ :

"اے انسان تم نے کس چیز پر تکیہ کیا ہے ؟"

اہم مسئلہ یہی ہے ۔ اس لیے ہم نے کہا ہے کہ نظریۂ کائنات کی کیفیت ہر مکتب کے مخاطبین کو متعین کرتی ہے اور ان دونوں مسائل کا آپس میں تعلق ہے ۔

اسلام کا انسان کے بارے میں ایسا نظریہ نہیں ہے کہ اس کا وجدان اس کی قومیت یا نسل یا طبقہ کا تار چھیڑنے سے متحرک ہو بلکہ اسلامی نظریہ کائنات میں اصول 'فطرت' کارفرما ہے۔

" کل مولود یولد علی الفطرۃ "

جس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ہم پہلے لکھ آئے ہیں ۔

اس اصول کے مطابق پروردگار نے تخلیق کے ضمن میں ہر انسان کو ایک شریف وجدان اور ملکوتی روح عطا کی ہے :

" ونفخت فیہ من روحی "

لہٰذا ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کسی ماں باپ کا بھی بیٹا ہو اس میں یہ شریف وجدان موجود ہے ۔ قومی وجدان ، نسلی اور طبقاتی وجدان ۔ یہ سب اکتسابی وجدان ہیں ۔ اسلامی دعوت میں صرف شریف وجدان کو مخاطب کیا گیا ہے ۔

یعنی کہا گیا ہے :

" اے انسان ! چونکہ تم انسان ہو اس لیے میں تمھیں
دعوت دیتا ہوں تمھاری محرومی کی وجہ سے تمھیں

محروم کہہ کر نہیں پکارتا اور نہ تمہارا رنگ کالا ہونے
کی وجہ سے تمہیں سیاہ فام کہتا ہوں۔"

اسلامی دعوت میں تکیہ انسانی مفاخر پر ہے نہ کہ قومی نسلی برتری یا مادی مفادات پر۔

دوسرے لفظوں میں جو شخص عدل کا طلب گار ہے اسے مخاطب کیا جاتا ہے اس لیے نہیں کہ اس کا مفاد عدل میں ہے بلکہ اس لیے کہ عدل ایک انسانی قدر ہے۔

قرآن مجید کی نص کے مطابق اسلام کا ایک بنیادی مقصد عدل قائم کرنا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ جب عدل قائم ہوگیا تو حد سے بڑھنے والے اور ظالم لوگ نقصان اٹھائیں گے اور مظلوم لوگ نفع پائیں گے۔ لیکن یہ کہنے میں کہ اسلام کا مقصد ہی مستضعفین پر احسان کرنا ہے اور انھیں نجات دلانا ہے اور یہ کہنے میں کہ قرآن نے صرف مستضعفین کو مخاطب کیا ہے، بہت فرق ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اسلام تمام مستضعفین کو نجات دلاتا ہے لیکن اس کا خطاب تمام انسانوں سے ہے۔ حتیٰ کہ فرعون جیسے لوگ بھی قرآن کے مخاطب ہیں کیونکہ قرآن ہر انسان خواہ وہ فرعون ہو کی بنیاد میں ایک حقیقی انسان پاتا ہے اور کہتا ہے کہ:

"یہ فرعون جو اب تم پر حکومت کر رہا ہے
ایک جابر و ظالم مخلوق ہے اور دائرۂ انسانیت
سے خارج ہے۔"

البتہ اس کے ساتھ وہ ایک خداداد فطرت کا مالک ہوتا ہے چونکہ

وہ ایک انسان ہے لہٰذا جب خدا کے رسولؑ فرعون کے ساتھ جنگ کرنے آتے ہیں تو پہلے یہی کوشش کرتے ہیں کہ اس کے اندر کے انسان کو اس کے خلاف بھڑکائیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

" اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝

یعنی اے موسیٰؑ! جاؤ دیکھو کیا تم اس اندرونی انسان کو جو وہاں قید ہے۔ اسے نجات دلا سکتے ہو۔

بلکہ اسے برانگیختہ کرو اور اگر یہ کام نہ کر پاؤ تو باہر سے اس پر حملہ کرو۔

یعنی پہلے اندر سے اور پھر باہر سے اس پر حملہ آور ہو۔

توحید کا پیغام

اس آیت کا دوسرا حصہ قرآن کا بنیادی ترین پیغام ہے اور دوسرے تمام پیغامات کی اساس ہے۔ توحید کا پیغام صرف ختم المرسلینؐ سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء کی رسالت کے منشور کی سرلوح یہی پیغام تھا۔

قرآن کی نظر سے یہ مسئلہ یوں پیش کیا گیا ہے کہ کبھی انسان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم اولاً ایک موجود کی عبادت کرو اور ثانیاً وہ موجود جس کی تم عبادت کر رہے ہو خدا ہے۔

نہیں ــــــ!

بلکہ انسان عبادت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمام لوگ ایک نہ ایک طرح سے عبادت اور پرستش کرتے ہیں اور یہ عبادت انسان کے ذاتی اور

فطری جذبات سے الگ ہے۔ یعنی انسان فطری طور پر اس بات کی طرف رجحان رکھتا ہے کہ ایک چیز کو مقدس سمجھے اور اپنے آپ کو اس سے قریب تر کرے۔ یہ رجحان تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے اور تمام مادہ پرست بھی کسی نہ کسی چیز کی پرستش کرتے ہیں حتیٰ کہ کارل مارکس کہتا ہے کہ :

"میں چاہتا ہوں کہ انسان کو غیر انسان کی پرستش سے
آزاد کروں تاکہ انسان اپنے آپ کی پرستش کرے۔"

یعنی وہ بھی یہ چیز سمجھتا ہے کہ انسان کو کسی چیز کی پرستش کرنی چاہیئے لیکن بقول اپنے وہ انسان کو حقیقی معبود دکھانا چاہتا ہے۔

قرآن کا پیغام یہ ہے کہ :

اے انسان اپنے رب، اپنے پروردگار، اپنے صاحبِ
اختیار کی پرستش کرو۔ وہ صاحبِ اختیار جس کے
ارادے کے ساتھ ساری ہستی وابستہ ہے۔

اگر وہ ایک لمحہ بھی غافل ہو جائے تو سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو جائے۔

" اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
...... "

" وہی ہے جس نے تمھیں اور تمھارے اسلاف
کو پیدا کیا۔"

ہم پہلے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں عبادت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے یہ بات بتا چکے ہیں کہ عبادت کا قرآن کی اصطلاح میں وسیع مفہوم ہے۔ عبادت کا ایک عالی ترین درجہ یہ ہے کہ انسان کسی کے سامنے سجدہ کرے لیکن جب اس مرحلے سے گزریں تو قرآن ہر اطاعت کو عبادت شمار کرتا ہے اور فرماتا ہے۔

"جس نے اپنے نفس کی خواہش کی اطاعت کی وہ خود پرست ہے"

"افرایت من اتخذ الٰھہ ھواہ"

(سورۂ جاثیہ ۔ آیت ۲۳)

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنے نفس کی خواہش کو اپنا رب بنا رکھا ہے؟"

گویا خود پرستی کی اصطلاح قرآن کی اسی آیت سے ماخوذ ہے ۔ ظاہر ہے خود پرستی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے آپ کو مروجہ طور پر سجدہ کرے بلکہ اس کا مطلب اطاعت اور پیروی ہے ۔

شرک اور توحید

جو نکتہ یہاں قابل ذکر ہے یہ ہے کہ توحید شرک کا متضاد ہے ۔ شرک کا کلمہ مشارکت سے نکلا ہے جیسا کہ قرآن میں موسیٰؑ نے خدا سے یہ تقاضا کیا ہے:

"واشرکہ فی امری"

"یعنی رسالت کی تبلیغ میں ہارونؑ کو میرے ساتھ شریک کر"

اب دیکھتے ہیں کہ کیا شرک کا مفہوم یہ ہے کہ لازمی طور پر انسان غیر خدا کو خدا کے ساتھ شریک کرے ۔ یعنی بیک وقت اس کے دو معبود ہوں اور اگر بالفرض انسان مکمل طور پر خدا کی پرستش نہ کرے اور صرف غیر خدا کی پرستش کرے تو یہ شرک نہیں ہے ۔

مثلاً قوم سبا کا قصہ بیان کرتے ہوئے قرآن مجید میں آیا ہے کہ

ہُدہُد نے سلیمانؑ سے کہا :

" جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَقِيْنٍ "

" میں تمھارے لیے سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں ۔ "

" اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ .

...... "

" میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا جن پر ایک عورت حکمرانی کر رہی تھی ۔ اس کا ایک تخت اور عظیم عرش تھا اور وہ عورت اور قوم سورج کی پرستش کرتے تھے ۔ "

کیا یہ لوگ جو سورج کو پوجتے تھے اور سورج کے علاوہ کسی چیز کو نہیں پوجتے تھے ۔ چونکہ ان کا ایک معبود (سورج) تھا لہٰذا وہ مشرک نہیں ہیں ؟

قرآن کی اصطلاح میں شرک کا مطلب صرف اعتقاد میں ثنویت نہیں بلکہ شرک کا مطلب غیر خدا کی جگہ خدا کو پیش کرنا ہے ۔ چونکہ قرآن کی منطق کے مطابق تمام موجودات خدا کی پرستش کرتی ہیں اب اگر کسی نے غیر خدا کو خدا کی جگہ قرار دیا تو بندگی میں اس نے خدا کے شرک کا اقرار کیا ۔ اگرچہ وہ خود باطل معبود کے سوا کسی دوسری چیز کی پرستش نہیں کرتا لہٰذا وہ لوگ بھی مشرک ہوئے جو سورج پرست ہیں ۔

" لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "

" شاید تم متقی بن جاؤ ۔ "

اس آیت میں تقویٰ کو توحید کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ کیسے ہوا؟

تقویٰ کا ماخذ "وقی" یعنی پاسبانی ہے اور یہ پاکیزگی سے مشروط ہے۔ جیسا کہ قرآن اور اہل بیتؑ کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ تقویٰ کے بھی ایمان کی طرح کئی درجات ہیں۔

ہر پاک عقیدہ کے لیے پاک فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح گندم کے بیج کو زمین میں اُگنے کے لیے زمین کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح صحیح افکار کی نشوونما کے لیے پاک اور سالم روح وروان کا ہونا لازمی ہے۔ بالفرض کوئی پاک فکر کسی ناپاک روح میں داخل ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے اور آخر کار یا روح مغلوب ہو کر پاک ہو جاتی ہے یا روح غالب آکر اس فکر کو چلتا کرتی ہے۔

سورہ بقرہ کے شروع میں کہا گیا ہے کہ:

"یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو متقی ہیں۔"

اس تقویٰ سے مراد وہی اوّلین فطری تقویٰ ہے جس پر سب پیدا ہوتے ہیں جو لوگ اپنے اس تقویٰ کی حفاظت کرتے ہیں قرآن کی ہدایت ان لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ گناہ میں ملوث ہو گئے وہ کلام حق کو قبول نہیں کریں گے۔

قرآن مجید زیر بحث آیت میں فرماتا ہے کہ اگر انسان خدا کی پرستش کرے تو اس کی روح مضبوط ہو گی اور روان کی پاکیزگی بڑھے گی اور وہ پاکیزہ عقائد کو بھی بہتر طور پر قبول کرے گا اور اس سے پاکیزہ اعمال سرزد ہوں گے۔

"اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا"

کیسے انسان اس خدا کو نہ پوجے جب کہ وہ پروردگار کی ربوبیت کے مظاہر

دنیا ہیں دیکھ رہا ہے۔

یہ زمین جو تمھارے لیے ایک بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے کیا کسی حادثہ کی معلول ہے یا ربوبیت کی معلول؟

یہ آسمان جو چھت کی طرح تمھارے اوپر جلوہ گر ہے اور اس میں قندیلیں آویزاں ہیں اور ستاروں کی صورت میں چمکتی ہیں۔ یہ کیسے بن گئی ہیں؟

تم بادل کو دیکھئے جو آسمان میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر بارش کی صورت میں زمین پر برستا ہے اور زمین میں سے رنگ برنگے نباتات اگنے کا سامان مہیا کرتا ہے۔ طرح طرح کے پھل تمھیں فراہم کرتا ہے۔

کیا یہ سب چیزیں خود بخود پیدا ہوگئیں یا ان کا کوئی خالق ہے جو ایک مربوط نظام کے تحت سب کو ترتیب وار چلا رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایسے خالق کی جس سے رحمت و بخشش کے سوا کسی چیز کا صدور نہیں ہوتا پرستش کرنی چاہیے۔ نہ پتھر کی کہ جو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ انسان کی کہ اس کی پرستش غلامی کے مترادف ہے۔

جس موجود کی پرستش عین آزادی ہے وہ "اللہ" ہے۔

خلاص حافظ از آن زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

"وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا ....
..... وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ۔"

(آیت ۲۳-۲۴)

ترجمہ: "ہم نے اپنے بندے (پیغمبرؐ) پر جو کچھ نازل کیا ہے اگر تمھیں اس کے بارے میں شک ہے تو (کم از کم) اس جیسی ایک سورہ ہی لے آؤ اور خدا کے

سوا جو تمھارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر
تم سچے ہو لیکن اگر ایسا نہ کر سکو اور ہر گز نہیں
کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی
اور پتھر ہوں گے اور جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"
" وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی
عَبْدِنَا ...... "

قرآن مجید نے یہاں معجزے کی بحث پیش کی ہے اور قرآن کو ایک معجزے کے طور پر پیش کیا ہے اور لوگوں کو دعوت دی ہے کہ اگر وہ قرآن کو ایک بشری کتاب سمجھتے ہیں تو اس جیسی وہ بھی ایک کتاب بنا لائیں۔

لیکن سورہ بنی اسرائیل میں قرآن نے نہ صرف حضرت رسول اللہؐ کے معاصر عربوں اور عجمیوں کو بلکہ روئے زمین کے ہر زمانے میں ہر بشر کو یہ دعوت دی ہے بلکہ جنات کو بھی اس حکم میں شامل کر لیا ہے۔ اور کہا ہے:

" کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں
کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے
اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔"

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۸)

اس قسم کی آیات دو حقیقتوں کی ترجمان ہیں:

ایک یہ کہ دنیا میں معجزہ کا وجود ہے۔
اور دوسرا یہ کہ خود قرآن معجزہ ہے۔

ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی قرآن کی رو سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

معجزہ سے انکار کرنا قرآن سے انکار کرنا ہے

ہمارے زمانے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو معجزے کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ کسی طرح قرآن کو قبول کریں لیکن قرآن کے معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں یا اس دنیا میں معجزے کو سرے سے مانتے ہی نہیں اور قرآن میں جن معجزات کا ذکر ہے مثلاً دریا کا حضرت موسیٰ کو راستہ دینا یا ان کے عصا کا اژدہا بن جانا۔ وہ ان معجزوں کو طبیعی مفہوم دے کر ان کی نامناسب توجیہ کرتے ہیں اور یہ عمل قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔

قرآن مجید میں کئی مقامات پر انبیاء کے معجزات نقل کیے گئے ہیں۔ زیر بحث آیت میں بھی پہلے معجزہ کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے اور پھر قرآن کو ایک الٰہی معجزہ بتایا گیا ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآن کی دعوت کو جو ہمیشہ بیدار دل کو ضمیر کے ساتھ غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے قبول کریں اور غور و فکر کے قابل موضوعات کو جن میں سے ایک موضوع یہی قرآن کا معجزہ ہونا ہے اس پر غور کریں اور اس راز کو جو کہ اسلامی معارف کا سب سے بڑا راز ہے کھولیں۔

لفظ "معجزہ"

معجزہ کا مادّہ "عجز" ہے۔ عجز یعنی ناتوانی۔ اور معجزہ یعنی وہ کام جو دوسرے نہ کر سکتے ہوں۔ کبھی معجزہ کی جگہ "مافوق الفطرت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ اشاعرہ[1] کی تاویل ہے اور یہ لفظ معجزہ کے لیے مناسب نہیں ہے۔

---

[1] اشاعرہ ابوالحسن علی بن اسمٰعیل اشعری کے پیروکار اور اہلسنت تھے جو جبر کے نظریے کے معتقد تھے۔

اصولی طور پر قرآن میں نہ لفظ "معجزہ" استعمال ہوا ہے اور نہ "ما فوق الفطرت" اگرچہ یہ دونوں ہی اسلامی اصطلاحات ہیں۔ البتہ "معجزہ" کی اصطلاح عامۃ المسلمین میں رائج ہے اور شاید ائمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن "ما فوق الفطرت" کی اصطلاح کا رواج ایسا نہیں تھا بلکہ صرف مسلمان علمائے کلام کا ایک خاص گروہ یعنی اشاعرہ اسے معجزہ کے معانی دے کر استعمال کرتے رہے۔

قرآن نے جو دوسرا لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ "آیت" ہے جو ہمارے خیال میں "معجزہ" اور "ما فوق الفطرت" جیسے الفاظ سے زیادہ مفہوم کو سمجھاتا ہے۔

قرآن نے "معجزہ" کو "آیت" کیوں کہا ہے؟

"آیت" یعنی نشانی یا پختہ دلیل جسے ہم معجزہ کہتے ہیں قرآن نے اسے کیوں "آیت" کہا ہے؟

اس لیے کہ اگر کوئی بھی آدمی کھڑا ہو کر یہ کہہ دیتا ہے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں۔ اس نے مجھ پر وحی نازل کی ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے قبول کیا جائے کیونکہ میری باتیں میری اپنی نہیں بلکہ خدا کی ہیں۔

کیا لوگ بلا چون و چرا اس کی باتوں کو قبول کر لیں گے یا نہیں۔ ظاہر ہے یہاں تین طرح کے گمان پیدا ہو سکتے ہیں:

- ایک یہ کہ واقعی وہ شخص خدا کا پیغام لایا ہو۔
- دوسرا یہ کہ وہ جھوٹا اور جعل ساز ہو اور خود بھی اپنے جھوٹ سے آگاہ ہو۔
- تیسرا یہ کہ خود اس کے تئیں بھی مسئلہ غلط شکل اختیار کر گیا ہو یعنی

اس کے روح کے باطن میں کوئی حرکت پیدا ہوئی ہو تو اس نے اُسے وحی سمجھ لیا ہو۔

اس تیسرے گمان کا اطلاق اکثر مدعی لوگوں پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جنھوں نے جھوٹ نہیں کہا اور نہ ہی وہ جھوٹ بولنا چاہتے ہیں لیکن سچائی کے ہوتے ہوئے بھی وہ توہمات کا شکار ہو گئے۔ اور خود ان پر بھی بات مشتبہ ہو گئی۔

قریش کے کفار جب رسول اللہؐ کو "مجنون" کہتے تھے تو اس کی ایک وجہ یہ تھی چونکہ رسول اللہؐ کا لوگوں کے ساتھ سابقہ اس طرح رہا تھا کہ اگر کفار انھیں "جھوٹا" کہتے تو یہ تہمت رسول اللہؐ پر صادق نہ آتی۔ لہٰذا انھوں نے رسول اللہؐ کی دعوت کو دبانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو لوگ ان کی دعوت قبول کرتے تھے ان سے کہتے کہ یہ شخص نفسیاتی اور روحانی توہمات کا شکار ہو گیا ہے۔

لہٰذا جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اسے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے پختہ دلائل پیش کرنے ہوتے ہیں۔ اگر عوام اس سے دلائل طلب کرتے ہیں تو یہ منطقی بات ہے۔ ورنہ بغیر دلیل کے بات قبول کر لینا احمقانہ فعل ہے۔

معجزہ بھی وہی پختہ دلیل ہے جو نبوت کے دعویٰ کو ثابت کرتا ہے اور اسی لیے اسے "آیت" کہا گیا ہے۔

اس بات کی وضاحت کے لیے ہم بحث کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں:

(۱) —— معجزہ کیا ہے؟

(۲) —— کیا معجزہ ممکن ہے؟

(۳) —— کیا معجزہ کبھی واقع ہوا ہے؟

(۴) —— معجزہ کیسے مدعی کی صداقت کی دلیل بن سکتا ہے؟

۵ — پیغمبرِ اسلام کے معجزات
۶ — قرآن کا معجزہ

۱۔ معجزہ کیا ہے؟

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معجزہ کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اہم مسئلہ خدا کا ماننا یا نہ ماننا ہے۔

یعنی اگر ہم نے خدا کو مان لیا تو پھر معجزہ پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہمارا قبول کردہ خدا قادرِ مطلق ہے اور "اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" کے مطابق وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردہ کو زندہ کرے اور عصا کا اژدہا بنا دے۔ اور اپنے رسولؐ کو ایک لمحہ میں مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے جائے بلکہ تمام آسمانوں کی سیر کرا دے۔

لیکن ہمارے خیال میں یہ مسئلہ اس قدر سیدھا سادہ نہیں کہ اگر خدا کو قبول کر لیا تو تمام مشکلات حل شدہ ہیں کیونکہ:

(ا) بعض لوگ ممکن ہے معجزے کی تشریح یہ کریں کہ معجزہ اسے کہتے ہیں جو بلا سبب سرزد ہو۔

لیکن یہ تشریح بہت غلط ہے۔ شاید مادہ پرستوں اور معجزہ کی نفی کرنے والوں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کیا ہے۔ بعد میں یہی تشریح زبان زد عام ہو گئی۔

کیونکہ جو لوگ معجزے کے حامی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ معجزہ کسی چیز کی دلیل ہو اور اگر معجزہ بغیر کسی سبب کے واقع ہوا ہو تو وہ کسی امر پر دلیل نہ ہو گا۔

اگر بفرضِ محال ایک شے بغیر سبب کے پیدا ہو جائے تو پھر دنیا میں کسی چیز کا اثبات نہیں کیا جا سکتا۔ نہ علمی اور طبیعی اصولوں میں سے کوئی اصول برقرار

رہتا ہے اور نہ فلسفہ و کلام کا اصول۔ حتیٰ کہ خدا کا اثبات بھی متزلزل ہو جاتا ہے کیوں ــــــ ؟

کیونکہ ہم خدا کو اس لیے مانتے ہیں کہ وہ علت عالم ہے۔ اگر بالفرض کائنات کا کوئی نظام نہ ہو بلکہ ممکن ہو کہ کوئی چیز بغیر سبب کے ظاہر ہو جائے تو ہم اس احتمال کو رد نہیں کرسکتے کہ کائنات بغیر علت کے پیدا ہو گئی ہے لہٰذا معجزہ کی یہ تشریح انتہائی نامناسب ہے۔

(۲) ممکن ہے کچھ لوگ یہ کہیں کہ معجزہ بغیر علت کے پیدا شدہ چیز کے سوا کچھ نہیں ہے۔

استثناء قانونِ علیت میں نہیں بلکہ اس مفہوم میں ہے کہ ایک حقیقی علت کی جگہ کوئی دوسری علت لے لے اور معجزہ بھی یہی ہے کہ ایک علت کا دوسری علت کی جگہ لینا۔

مثلاً انسان کے پیدا ہونے کی حقیقی اور واقعی علت دو انسانوں کا اختلاط ہے۔ اب اگر یہ علت ختم ہو جائے اور اس کی جگہ دوسری ست لے لے۔ اور ایک انسان' انسانوں کے اختلاط کے بغیر پیدا ہو جائے تو یہ معجزہ ہے۔

یہ بات بھی علوم عقلی کی سمجھ بوجھ نہ رکھنے کی ترجمانی کرتی ہے۔ کیونکہ ہم یہ بات تسلیم کرچکے ہیں کہ دنیا میں علت اور معلول کا نظام کارفرما ہے۔ یہ ایسا نظام نہیں ہے کہ اسے تبدیل کیا جاسکے بلکہ یہ ایک حقیقی رابطہ پر مبنی ہے اور یہ خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔

یعنی عالم فطرت میں اگر "الف" ب کی علت ہو تو "الف اور ب" میں ایک ایسا حقیقی رابطہ ہے کہ نہ "الف" ویسا رابطہ ب کے علاوہ کسی سے رکھ

سکتا ہے اور نہ کبھی "ب" "الف" کے بغیر اپنی ہستی پا سکتی ہے۔ ایک امر کی حقیقی علت ایک امر ہے اور کوئی چیز دو چیزوں سے علت اور معلول کا رابطہ نہیں رکھ سکتی۔

مذکورہ مثال میں کبھی بھی "ج" "الف" کی جگہ نہیں لے سکتا یا "د" "ب" کی جگہ الف کا معلول نہیں بن سکتا۔

(۳) معجزہ کی ان دو تشریحات کے علاوہ ایک تیسری تشریح بھی ہے جس پر مذکورہ عقلی اعتراضات وارد نہیں ہو سکتے۔

اور وہ یہ کہ معجزہ نہ قانون کی علیت کی نفی ہے اور نہ اس کا استثنار اور نقض بلکہ یہ فطرت کی خرقِ ناموس ہے۔

علیت کے قانون کے خرق اور خرق قانون طبیعت میں فرق ہے۔ معجزہ یہ نہیں کہ کسی چیز کا ظہور اصلی علت کے علاوہ کسی طریقے سے ہوا ہو بلکہ معجزہ یہ ہے کہ غیر معمولی اور غیر طبیعی طریقے سے کوئی کام سرزد ہوا ہو۔

دوسرے لفظوں میں معجزہ یہ ہے کہ کوئی کام اپنے معمول سے ہٹ کر اس طریقے سے انجام پایا ہو کہ اس میں مافوق الطبیعۃ مداخلت صاف دکھائی دیتی ہو۔

لہٰذا کسی معجزہ کے ظہور میں ایک علت دوسری علت کی جگہ نہیں لے سکتی بلکہ یہ بات کہ علت اور معلول کے درمیان ایک قسم کا حقیقی رابطہ موجود ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی، تسلیم شدہ ہے لیکن معجزہ کے مسئلہ کی اس طرح توجیہ ہو گی۔:

اشیاء کی حقیقی علل ہمیشہ انسان پر پوشیدہ رہی ہیں کیونکہ وہ علم اور تجربے کی بنا پر ان تک پہنچنا

چاہتا ہے۔ صرف خدا اشیاء کی حقیقتِ علت سے آگاہ ہے۔ انسان تجربے کی بنیاد پر صرف اشیاء کے رابطے کو معلوم کرسکتا ہے جسے وہ غلط طور پر علیت کا رابطہ سمجھ بیٹھتا ہے۔

اس بناء پر معجزہ وہ امر ہے جو غیر معمولی راستے کے ذریعے ظاہر ہو جبکہ انسان اس کے ظہور کا ایک راستہ جانتا ہو۔

۲۔ کیا معجزہ ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب کسی حد تک دیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ معجزہ ممکن ہے یا مشکل؟

اس کا تعلق معجزہ کی تعریف سے ہے اور ہم اس کی توجیہ کیسے کرتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ بغیر کسی علت کے واقعات کا ظہور پذیر ہونا معجزہ ہے تو یہ محال ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ معجزہ دراصل قانونِ علت کا نقض ہے یعنی یہ کہ کسی علت کی جگہ کوئی دوسری علت رکھ دی جائے تو پھر بھی ممکن نہیں ہے۔

لیکن اگر اس کا تیسرا مطلب لیا جائے یعنی یہ کہ معجزہ ایک معمول کا عمل نہیں ہے، تو اس صورت میں معجزہ ممکن ہے، محال نہیں۔

یہاں مذکورہ تعریفات کی مزید تشریح کی ضرورت ہے۔

یورپ کے مشہور فلسفی ہیگل نے اپنے فلسفے میں اس قسم کے اکثر مسائل کا ذکر کیا ہے۔

وہ کہتا ہے:

"بعض مسائل اس قسم کے ہیں جو عقل کی ضرورت سمجھے
جاتے ہیں اور ان کے خلاف کچھ کرنے کی اجازت
نہیں ہوتی۔"

یعنی اس کے خلاف سرے سے کچھ امکان پذیر ہی نہیں ہے۔ مثلاً ریاضی میں "تحلیلی مسئلہ" آپ ریاضی میں کہتے ہیں کہ ایک مثلث کے تمام زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے ہے یا دو قائموں کے مساوی ہے۔ یہ حکم عقل کی ضرورت ہے یعنی اگر عقل مثلث کو سمجھ لے کہ مثلث کیا ہے۔ تو فوری طور پر ضرورت کے تحت اسے قبول کرلے گی۔ مثلث کے زاویوں کے مجموعہ ۱۸۰ درجے کو آدھا درجہ بھی کم یا زیادہ کرنا محال ہے۔

فلسفہ اور منطق میں بعض مسائل کو مسائل ضروریہ گنا جاتا ہے وہ بھی ریاضی کے مذکورہ مسئلہ ہی کی طرح ہیں۔ مثلاً اجتماع نقیضین اور ارتفاع نقیضین۔

لیکن اس کے برعکس کچھ مسائل تجربی ہیں۔ یعنی وہ ایسے مسائل ہیں جن میں عقلی طور پہ ہم نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ جیسا ہم نے انھیں پایا ہے ویسا ہی انھیں بیان کردیتے ہیں۔

اس قسم کے مسائل کے لیے ہیگل نے جو مثال پیش کی ہے وہ یہ ہے:

"ہم نے اب تک اس دنیا میں جو تجربہ کیا ہے اس
سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ پانی سو درجہ حرارت کے
نتیجے میں بھاپ بن جاتا ہے۔"

اس وقت ہم اس کا نام "علّیت" رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حرارت پانی کے بھاپ بننے کی علت ہے یا سردیوں میں پانی منفی صفر درجہ پر منجمد ہوجاتا ہے۔ تو کہتے کہ سردی انجماد کی علت ہے۔

ہیگل کہتا ہے:

"ان مسائل میں انسانی عقل کی ضرورت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ چونکہ ہم نے ایسے ہوتے دیکھا ہے لہٰذا ایسا کہہ دیتے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی پیدائش کے وقت اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہوتا یعنی حرارت کو انجماد کا موجب اور سردی کو پانی کے بھاپ بننے کا موجب پاتے تو ہماری عقل کے مطابق اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

یعنی ٹھنڈک کے نتیجے میں انجماد اور حرارت کے نتیجے میں بھاپ بننے کو عقلی ضرورت قبول نہیں کرتی۔ بلکہ یہ صرف ایک وجودی مسئلہ ہے۔ یعنی دنیا میں ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس کے خلاف بھی ضرورت ہو۔

یہاں تک بات بالکل صحیح ہے اور بوعلی سینا جیسے حکماء نے بھی اس امر کا ادراک کر لیا تھا۔ ان کی کتابوں میں یہ بات موجود ہے کہ طبیعی علوم جو کہ ہمیشہ تجربہ کے مرہون ہوتے ہیں۔ اور تجربہ بھی ضرورت پیدا نہیں کرتا۔ ان کے بارے میں کیا کیا جائے۔

اس نکتے کے پیش نظر طبیعی علوم و قوانین کس قسم کے اعتبار کے حامل ہو سکتے ہیں۔ کیا تجربی قوانین کو فلسفے کے ضابطہ علیت کے نیچے لایا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ جن باتوں میں تجربہ کسی رابطے کی نشاندہی کرے۔ مثلاً حرارت تبخیر کا اور ٹھنڈک انجماد کا سبب بنتی ہے تو یہاں ایک علیت موجود ہوتی ہے اور وہ بات علیت کے بغیر ہو بھی نہیں سکتی اور وہ حقیقی علت محال ہے کہ اپنی جگہ کسی دوسری علت کو دے۔ لیکن یہ کہ وہ علت

وہی ہے جسے ہم نے اپنے حواس کے ذریعے آزمایا ہے اور اس کا انکشاف کیا ہے، مشکوک ہے۔ لہٰذا علوم تجربی ہر روز بدلتے رہتے ہیں، ایک قانون منسوخ ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا قانون لے لیتا ہے۔

مثلاً ایک زمانے میں جب یہ دیکھا جاتا کہ جس پتھر کو ہم اوپر سے گراتے ہیں وہ زمین پر گرتا ہے تو کہا جاتا تھا کہ خود پتھر میں ایسی کشش موجود ہے جو مرکز زمین کی طرف جانا پسند کرتی ہے۔ مکرر تجربات کی بنا پر سبھی اس نظریے پر متفق ہوچکے تھے لیکن جب نیوٹن آیا تو یہ نظریہ بدل گیا اور کہا جانے لگا کہ:

"پتھر میں کشش نہیں ہے بلکہ زمین میں ایسی کشش موجود ہے جو پتھر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔"

اس کے بعد نظریۂ اضافیت پیش ہوا اور سابقہ نظریہ پر نظرثانی ہوئی۔

لہٰذا اس قدر تو بات ثابت اور یقینی ہے کہ واقعات کا ظہور علت کے بغیر نہیں ہوتا۔ لیکن کیا علم ان علتوں تک پہنچ پائے گا یا نہیں؟

یہ کسی کو پتہ نہیں۔ اور یہ کہ ہم جونہی دو چیزوں کے درمیان کسی رابطہ کا سراغ لگاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں یہ علت ہے، جو غلطی ہے۔

یہ حقیقی علت نہیں ہے۔

یہ حرارت تبخیر کی علت ہے نہ ٹھنڈک انجماد کی علت اور نہ کشش پتھر کے نیچے گرنے کا سبب لہٰذا اس قسم کے رابطے اکثر اوقات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

یہاں "قانونِ طبیعت" اور قانونِ علیت کے درمیان فرق بخوبی ظاہر ہے۔ مثلاً طبیعی قانون کے مطابق ہم نے دیکھا ہے کہ اگر ایک انسان پیدا ہونا چاہیے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ مذکر اور مؤنث دونوں ہوں اور ان کا نطفہ آپس میں ملے اس سے انسان پیدا ہوتا ہے۔

لیکن کیا یہاں علیت کا قانون حکم فرما ہے۔ یعنی کیا اس کے علاوہ محال ہے اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ عورت کے رحم میں جو مادہ ہوتا ہے اس میں ایسی صلاحیت ہو کہ وہ عورت کے مادے کا کام بھی انجام دے اور مرد کے مادے کا بھی؟

عقل اس بات کی نفی نہیں کرتی بلکہ کہتی ہے:

"ہم نے اب تک ایسا ہی ہوتے دیکھا ہے لیکن ممکن ہے کوئی دوسری شکل بھی ہو جس کے راز کا ہمیں ابھی پتہ نہ چلا ہو۔"

اگر ایسا ہو جائے تو اس سے علیت کا قانون تو منسوخ نہیں ہوگا بلکہ طبیعت کے قانون کا توڑنے والا ہے اور یہی معجزے کا مفہوم ہے۔

یعنی معجزہ طبیعت کے قانون سے بالا چیز ہے اور اس مفہوم کے ساتھ معجزہ ممکن ہے۔

اب ہم پھر ہیگل کے نظریے کی طرف آتے ہیں:

اگر دنیا میں نبوت کا مدعی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو یہ کہے کہ میں ایسی مثلث بنا سکتا ہوں جس کے زاویے ۱۹۰ درجے ہوں۔ تو ایسے شخص کو ہم فوراً جھوٹا کہیں گے۔ یہ بات عقلی طور پر محال ہے اور معجزہ سابقہ بیانات کی روشنی میں عقلی لحاظ سے محال بات کو ممکن نہیں دکھاتا۔ لہٰذا ایسا دعویٰ مدعی کے کذب کی دلالت کرتا ہے۔

یا اگر کوئی نبوت کا مدعی یہ دعویٰ کرے کہ میں بغیر علت کے کام کر سکتا ہوں تو وہ بھی اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے کیونکہ وہ عقل کی ضرورت کے خلاف بات ہے۔

اگر کوئی مدعی یہ کہے کہ میں فطرت کے قانون کے خلاف کام کر سکتا ہوں

یعنی وہی کام کہ بقول ہیگل جن کے معتبر ہونے کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے سوائے اس کے کہ اب تک ہم انھیں ایسا ہی ہوتا دیکھتے چلے آرہے ہیں تو ہم اس دعویٰ کو قبول کرلیں گے ۔

دوسرے لفظوں میں عقلی قوانین مطلق ہیں مشروط نہیں ۔ یعنی ان میں اگر مگر نہیں ہے ۔ لیکن فطری قوانین مشروط ہوتے ہیں یعنی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک مثلث کے مجموعی زاویے دو قائمہ کے برابر ہیں تو ساتھ یہ نہیں کہا جاتا کہ :

"اگر کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی"

لیکن فطری قوانین میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ :

"قانون کشش کا تقاضا ہے کہ بڑا جسم چھوٹے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے بشرطیکہ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو"

یعنی اگر آپ نے اپنا ہاتھ اس چیز کے آگے رکھ دیا ہے اور پتھر گرنے کے مانع ہوئے ہیں تو قانون کشش اپنا کام نہیں کرے گا ۔

مختصر یہ کہ حقیقی اسباب وعلل کا سراغ لگانا انسانی بس کی بات نہیں ہے اور یہ اسباب اس پر پوشیدہ ہیں ۔ انسان صرف ایک طرح کے رابطوں کا پتہ لگا سکتا ہے صرف خدا ہی تمام اسباب وعلل سے آگاہ ہے ۔

سورہ طلاق میں کہا گیا ہے :

"ومن یتوکل علی اللّٰہ فھو حسبہ"

"جو شخص خدا پر توکل کرتا ہے خدا اسے کافی ہے"

یعنی اسے کسی ظاہری سبب کی حاجت نہیں ہے ۔

اس کے بعد کہا گیا :

" ان اللہ بالغ امرہ "

یعنی خدا اپنا امر پورا کر کے رہے گا۔

لیکن اس خیال سے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ کاروبار عالم میں کوئی علت و معلول موجود نہیں ہے فوراً یہ فرمایا گیا:

" قد جعل اللہ لکل شیئ قدرا "

یعنی ہر چیز کے لیے ایک حد ایک اندازہ ایک رابطہ مقرر کیا گیا ہے لیکن اس رابطے کو صرف خدا جانتا ہے۔

خدا جب بھی ارادہ کرے لوگوں کو علت و معلول سے آگاہ کرتا ہے اور اگر کوئی خدا کی طرف سے ان رموز سے واقف ہو گیا تو وہ کائنات کے کاموں میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے، نظام علت و معلول کے برخلاف کوئی کام کیے بغیر۔

یہ ہے اس روایت کا مفہوم کہ:

" خدا کا بندہ اپنے پروردگار سے اس قدر نزدیک ہے کہ خدا اس کی آنکھ بن جاتا ہے کہ اس کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس کا کان کہ اس کے ساتھ سنتا ہے اور اس کا ہاتھ کہ اس کے ساتھ کام کرتا ہے۔"

۳۔ کیا معجزہ واقع ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب بہت سادہ ہے جب معلوم ہو گیا کہ معجزہ قانون علیت سے بالاتر نہیں ہے تو دنیا میں معمول اور نیچر کے خلاف اکثر کام ہوئے ہیں

اور ہو رہے ہیں۔

بو علی سینا کا کہنا ہے کہ:

"اگر آپ نے سنا کہ کسی عارف نے ایک ماہ تک کوئی چیز نہیں کھائی اور وہ نہیں مرا تو اس میں حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ عمل فطرت کے قانون کے خلاف تو ہے لیکن ہستی کے مجموعی قانون کے برخلاف نہیں ہے۔"

کیونکہ اگر عام افراد ۴۸ گھنٹے کچھ نہ کھائیں پئیں تو وہ مرجاتے ہیں کیونکہ ان کا بدن روزمرّہ کی عادت کی رو سے غذا کا متقاضی ہوتا ہے۔

لیکن دوسرا انسان اپنے مضبوط ارادے سے اپنے بدن کو ایسا مسخر کر لیتا ہے کہ اس کے دل کی حرکت بھی اس کے قابو میں ہوتی ہے۔ سانس اس کے ارادے سے آتا جاتا ہے، کھانا اس کی نگرانی میں ہضم ہوتا ہے۔

اس قسم کے لوگ یوگیوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ریاضت کش لوگ طویل وقفے کے لیے اپنا سانس روک سکتے ہیں جب کہ ایک عام آدمی ایک منٹ کے لیے بھی سانس نہیں روک سکتا۔

یہ روح کو مضبوط کرنے کا نتیجہ ہے یعنی روح مضبوط ہو کر بدن پر غالب آچکی ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جب روسی حکام بھارت کے دورے پر گئے ہوئے تھے تو وہاں (ہندو یوگیوں کی) اس قسم کی ریاضتیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے اور جب اپنے وطن واپس گئے تو کہا کہ ایسے عملیات پر دانشگاہوں میں تحقیق ہونی چاہیے۔ گویا یہ بھی ایک علم ہے۔

ان حکام نے ہندوستان میں دیکھا کہ ایک شخص کو تابوت میں بند کر کے قبر میں دفن کر دیا گیا تھا اور سانس لینے کے لیے کوئی سوراخ نہیں رکھا گیا تھا بہت دیر بعد جب اسے باہر نکالا گیا تو اس نے سانس لینا شروع کر دیا۔ ظاہر تھا کہ مٹی میں دبنے کے بعد اس شخص نے سانس کو اپنے اختیار کے ساتھ روک لیا تھا اور اب باہر نکل کر سانس لینا شروع کر دیا تھا۔

بہرحال اس قسم کے عملیات اکثر پائے جاتے ہیں اور مشقوں کے ذریعے خواہ وہ غیر شرعی ہوں، ارادہ کی مضبوطی اس قسم کی تمام عملیات کی توجیہ کر سکتی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ معجزہ فطرت کے قانون کے خلاف انجام پاتا ہے اور اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ انبیاء خدا کی عنایت کے ساتھ مکمل انسانوں کا نمونہ تھے اور مضبوط روح اور ارادہ کے مالک تھے لہٰذا ان سے معجزہ کے صدور کی توجیہ بہت سادگی سے کی جا سکتی ہے

۴۔ معجزہ کیسے مدعی کی صداقت کی دلیل بن سکتا ہے؟

علمائے منطق کہتے ہیں کہ ہمارے پاس تین قسم کی دلالت ہوتی ہے:

(۱) ——— قراردادی

(۲) ——— طبیعی

(۳) ——— عقلی

قراردادی دلالت:

قراردادی دلالت یہ ہے کہ کسی چیز کو کسی چیز کی علامت قرار دینا۔ اس طرح

کہ اگر اس کے برعکس قرار دیا گیا ہوتا تو اس کی دلالت بھی برعکس ہوتی جیسے الفاظ معانی کی دلالت کرتے ہیں۔ "روٹی" کے لفظ سے معلوم ہے کہ یہ ایک کھانے والی چیز ہے اور "پانی" نام سے معلوم ہے کہ یہ ایک پینے والی چیز ہے۔

اگر اس کے برعکس نام رکھے گئے ہوتے یعنی روٹی کو پانی اور پانی کو روٹی کا نام دیا گیا ہوتا تو ان ناموں کو ویسی ہی دلالت کرنی تھی اور کوئی مشکل پیش نہیں آنی تھی۔ یعنی لفظ پانی اور مائع اور روٹی اور خوردنی مادہ کے درمیان کوئی ذاتی رابطہ نہیں ہے۔

یہی مثال ٹریفک کی بتیوں کی ہے۔ سبز بتی کو راستہ کھلا ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اگر اسے رکنے کی علامت قرار دیا گیا ہوتا تو اس کو ویسی ہی دلالت کرنی تھی۔

کیا نبوت کی صداقت پر معجزہ کی دلالت اسی نوعیت کی ہے؟ یعنی خدا نے لوگوں کے ساتھ بیٹھے کیا ہے کہ جب وہ کسی آدمی سے اس قسم کے عملیات دیکھیں تو یہ باور کر لیں کہ وہ آدمی خدا کی طرف سے آیا ہے اور جو کچھ کہتا ہے صحیح کہتا ہے۔

ظاہر ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ خدا جو پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے انبیاء کے ذریعے پہنچاتا ہے۔

طبیعی دلالت:

طبیعی دلالت یعنی تجربی دلالت۔

کھانسی سینے کے درد کی علامت ہے اور نبض کی تیز حرکت بخار کی علامت ہے۔ یہ طبیعی اور تجربی علامتیں ہیں یعنی تجربے کے بعد حاصل ہوئی ہیں۔

معجزہ کی دلالت اس قسم کی بھی نہیں ہے کیونکہ معجزہ انسان کے تجربے

میں شامل نہیں ہے۔

عقلی دلالت :

عقلی دلالت یعنی استدلالی دلالت۔

جیسے علت پر معلول کی دلالت۔ جب عقل کسی چیز کے وقوع کو دیکھتی ہے تو اس چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ علت کے بغیر کسی چیز کا پیدا ہونا محال ہے۔ وہ فوراً اس کی علت کو تلاش کرتی ہے اور یہ بات ناموں کے اطلاق یا تجربے کی محتاج نہیں ہے۔

معجزہ کی دلالت دو طرح سے بیان ہوسکتی ہے اور علمائے کلام کا عام طور پر یہ کہنا ہے کہ معجزہ ایک طرح کی عقلی دلالت ہے جو عملی طور پر ہوتی ہے۔ مثلاً جن باتوں میں انسانی عقل کسی شخص کے عمل سے اس کی مرضی معلوم کر لیتی ہے یا انسان کی خاموشی اس کی رضا سمجھی جاتی ہے یا معصوم کی تقریر فقہ میں حجت گنی جاتی ہے۔ اسی قبیل کی دلالتیں ہیں۔

کہتے ہیں کہ اگر کوئی معصوم صریحاً کسی کو وضو کرنے کا طریقہ بتاتا تھا یا خود وضو کرتا تھا تو ہمارے لیے حجت ہوتا تھا۔

اسی طرح اگر اس کے سامنے کوئی دوسرا شخص وضو کرتا اور معصوم اسے نہیں ٹوکتا تو عقلی دلالت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صحیح طریقے سے وضو کر رہا ہے۔ اگر صحیح نہ ہوتا تو معصوم اس پر اعتراض کرتا۔ چونکہ اس نے اعتراض نہیں کیا لہٰذا یقینی طور پر اس کی نظر میں وہ صحیح تھا۔

اگر کوئی سوال کرے کہ اگر وضو کرنے کا طریقہ صحیح نہ ہوتا تو معصوم کیوں اعتراض کرتا۔

ہم کہیں گے یہ کام لوگوں کو جہالت کی طرف لانے کے مترادف ہے اور یہ ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ معصوم ایسے عمل کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ نبوت کی صداقت پر معجزہ کی دلالت اسی نوعیت کی ہے وہ اس طرح کہ جب کوئی شخص آئے اور کہے کہ:

"لوگو! میں خدا کی طرف سے ہوں"

یہ چیز پیش نظر رکھتے ہوئے کہ خدا انسان کے تمام افعال سے آگاہ ہے لہٰذا اس شخص کا دعویٰ خدا کے حضور انجام پا چکا ہے۔ جب اس نے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کوئی خارق العادۃ کام انجام دیا جا ہے اسے اپنے ساتھ منسوب کیا جائے خدا کے ساتھ تو حتمی طور پر اس کے صدق کی دلیل ہوگا۔

کیونکہ اگر وہ جھوٹ کہہ رہا ہوتا تو خدا اسے یہ کام نہ کرنے دیتا کیونکہ اگر وہ جھوٹا تھا تو عملاً اس کی تائید کر دی اور لوگوں کو جہالت کی طرف لایا۔

یہ ہے وہ نظریہ جو عام طور پر متکلمین معجزہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں لیکن کچھ دانشوروں کا عقیدہ ہے کہ متکلمین معجزہ کی حقیقت سمجھ ہی نہیں سکے کیونکہ وہ گمان کرتے ہیں کہ معجزہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا براہ راست طور پر کوئی کام ایک پیغمبر کے ہاتھ سے انجام دلواتا ہے جبکہ پیغمبر کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ پیغمبر تو صرف ایک ظاہری چہرہ ہے۔ خدا پیغمبر کے ہاتھوں کام کرواتا ہے۔

عیسیٰؑ ایک مردے کے سرہانے کھڑے ہوتے ہیں لیکن خدا مردے کو زندہ کرتا ہے۔ عیسیٰؑ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے وہ تو ایک وسیلہ ہے یعنی براہ راست طور پر عمل خدا کا ہے اور جس طرح میں اور آپ معجزہ لانے میں کچھ اختیار نہیں رکھتے اسی طرح پیغمبروں کا بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ بات اس سے بالاتر ہے۔ معجزہ اور معجزہ دکھانے والے کے درمیان ایک

حقیقی ربط ہے گویا اس معجزہ کا صدور اس کے علاوہ کسی اور سے ناممکن ہے۔

معجزہ خدا کے "ولی" کے روحانی اور معنوی کمال کا ترجمان ہے۔ جب کسی ولی اللہ سے معجزہ صادر ہوتا ہے تو اس وقت اس کی انسانی طاقت الہی طاقت سے متصل ہوتی ہے۔ یعنی خدا نے اس کو ارادہ اور مافوق بشری طاقت اور قدرت عطا کی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا بیانات سے پتا چلتا ہے کہ خدا کا ولی خدا کی مکمل اطاعت اور عمل ریاضتوں کے بعد اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اسے ایسا مضبوط ارادہ حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ فطرت پر غلبہ پا سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان عبادت اور اطاعت کے سائے میں خدا کے اس قدر نزدیک ہو جاتا ہے کہ روئے زمین پر خدا کا مکمل نمونہ بن جاتا ہے۔

لہٰذا جب اولیاء اللہ خارق العادۃ کام انجام دیتے ہیں تو وہ خود یہ کام کر رہے ہوتے ہیں لیکن مافوق بشری طاقت کے ساتھ۔

یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت علی ابن ابیطالبؑ نے قلعہ خیبر میں وہ دروازہ ایک ہاتھ سے اکھاڑ پھینکا جو چالیس پچاس آدمی بمشکل ہلا سکتے تھے۔

" واللہ ما قلعت باب خیبر بقوۃ
جسدانیۃ بل بقوۃ الٰھیۃ ۔"

" خدا کی قسم! میں نے خیبر کا دروازہ کسی جسمانی
قوت سے نہیں اکھاڑا بلکہ الہی قوت نے میری
مدد کی ہے۔"

یعنی علیؑ کے انسانی بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی بلکہ ایک الہی قوت ان کی مدد کر رہی تھی۔ اس سے دس گنا وزنی دروازہ بھی ہوتا تو وہ

اسے اکھاڑ پھینکتے۔

پس حضرت علیؑ یہ کہتے ہیں کہ میں نے دروازہ اکھاڑا۔ ایسا نہیں کہتے کہ میں نے دروازہ نہیں اکھاڑا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا اور خدا نے دروازہ اکھاڑا۔ دروازہ میں نے اکھاڑا لیکن خداداد قوت سے۔

پس معجزے کا مطلب یہ ہے کہ اگر عیسیٰؑ مردے زندہ کرتا ہے تو کسی بشری طاقت سے زندہ نہیں کرتا اور نہ خدا براہ راست انسانی دخل کے بغیر ایسا کرتا ہے بلکہ انسان خدائی قوت کے ساتھ مردہ زندہ کرتا ہے۔

لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ نبوت کی سچائی پر معجزہ کی دلالت ایک عقلی دلالت ہے لیکن اس صورت میں عقلی دلالت نہیں جس شکل میں متکلمین کہتے ہیں بلکہ سو فیصد منطق پر مبنی عقلی دلالت ہے۔

۵۔ پیغمبر اسلامؐ کے معجزات

بعض مستشرقین اور عیسائی پادری قرآن اور ہمارے رسولؐ پر اعتراض کے طور پر ایک مسئلہ پیش کرتے ہیں جسے بعض مسلمان مصنفوں نے بھی قدرے دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے اور یورپی مصنفوں کے دعوی کو کم و بیش قبول کیا ہے۔ وہ مسئلہ ہے "پیغمبر اسلام کے معجزات" کا۔

عیسائی اس شکل میں مسئلہ پیش کرتے ہیں کہ:

"خود قرآن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب پیغمبر اسلام سے معجزے کا تقاضا کیا جاتا تھا تو وہ اس سے امتناع برتتے اور خود قرآن اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ معجزہ سے سخت انکار کر دیتے"

عیسائی علماء اس سلسلے میں جو آیات پیش کرتے ہیں آگے چل کر ہم ان کا جائزہ لیں گے۔

بعض مسلمانوں نے حال ہی میں یہ مسئلہ اس طرح پیش کیا ہے:

"بنیادی طور پر معجزہ کا تعلق بشریت کے ابتدائی عہد (بچپن) سے ہے۔ یعنی زندگی کا وہ عہد جب وہ ابھی خوف رکھتا تھا اور علم و تعقل اور منطق کے مرحلے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ چونکہ اس وقت علم و منطق کے ذریعے ممکن نہیں تھا کہ انسانوں کے سامنے مسائل پیش کیے جاتے لہٰذا انبیاء معجزے لاتے تھے:

دوسرے لفظوں میں انسان ایک بچے کی طرح تھا اور منطق استدلالی باتیں بچے کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں اور ناچار بقول شاعر:

چونکہ باکودک سروکارت فتاد
پس زبان کودکی باید گشاد

معجزہ ایک بچے کی زبان ہے۔ بچوں سے مراد سابقہ زمانوں کے لوگ ہیں۔ لیکن جونہی انسان فکری بلوغ کے مرحلے میں داخل ہوا تو اس سے علم و منطق کی زبان میں بات کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ پھر معجزے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جونہی کوئی پیغمبر مبعوث ہوا اور انسان کے سامنے اصلاح کا منصوبہ رکھا اور انسان کے لیے قوانین پیش کیے تو عقل و منطق رکھنے والا شخص فوراً اسے قبول کرے گا۔

پیغمبر اسلام کا گزشتہ تمام پیغمبروں سے یہ فرق ہے کہ وہ اس وقت

مبعوث ہوئے جب انسان خوف کے عہد سے نکل کر فکر و تدبر کے مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔

علامہ اقبال بھی اس سے ملتی جلتی تعبیر دیتے ہیں :

"پیغمبر اسلام ؐ تاریخ بشری کے ایسے دوراہے پر مبعوث ہوئے جس کا پچھلا دور جبلت اور خوف کا دور تھا اور اگلا دور علم، منطق اور فکری ارتقار کا دور ہونا تھا اسی لیے پیغمبر آخر الزمان ؐ کی وحی دوسرے پیغمبروں کی وحی سے مختلف تھی اور دراصل پیغمبر آخر الزمان اس لیے مبعوث رسالت ہوئے تھے تاکہ بشریت کو بلوغت، منطق اور استدلالی دور میں داخل کر دیں۔"

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ :

"پیغمبر کی بعثت کے منبع یعنی وحی کا تعلق بشریت کے پچھلے دور سے ہے اور رسالت کی روح کا تعلق آئندہ سے ہے۔ یعنی عقل، منطق، علم، تجربہ اور تاریخ سے نصیحت حاصل کرنے کی دعوت دینا۔"

اقبال کے نزدیک ختم نبوت کا فلسفہ یہی ہے۔ یعنی اس سے گزشتہ دو مطالب کا نتیجہ نکلتا ہے۔

پہلا ختم نبوت — اور

دوسرا معجزہ کی عدم ضرورت۔

یعنی اس طرح کی نبوت اور رسالت کے آنے سے (جو آخری نبوت و

رسالت ہے) نہ آئندہ نبوت اور رسالت کی ضرورت رہے گی نہ معجزہ کی ضرورت رہے گی کیونکہ معجزہ تو بشریت کے گزشتہ زمانے سے تعلق رکھتا تھا۔

یہ فلسفہ اقبالؔ نے پیش کیا اور بعض مسلمان مصنفین نے اس کی پیروی کی۔

ہم اس جگہ مفصل بحث نہیں کرنا چاہتے لیکن مختصراً یہ کہنا ہے کہ "ختم نبوت" کے فلسفے کو بیان کرنے میں ان لوگوں نے بہت زیادہ غلطی کی ہے[۱]

اس سے یہ مطلب نہ لیجیے گا کہ میرے مطابق اقبالؔ ختم نبوت کے قائل نہیں ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھنے میں غلطی کی ہے)

نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اس کے برعکس اقبالؔ ختم نبوت کو مانتے ہیں لیکن ان کی توجیہ درست نہیں ہے، وہ جو فلسفہ پیش کرتے ہیں اس کا نتیجہ ان کے تصور کے خلاف نکلتا ہے وہ اس توجیہ سے ختم نبوت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس کو درست مان لیا جائے تو بدقسمتی سے اس سے نتیجہ ختم مذہب نکلتا ہے۔ ختم نبوت نہیں۔ یہاں ہم بحث نہیں کریں گے۔ ہماری بحث معجزہ کے بارے میں ہے۔

ان اہل قلم کا نظریہ دو باتوں پر مشتمل ہے:

ایک یہ کہ بشر کے فکری بلوغ کے دور میں انسان کو معجزے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا یہ کہ اسی وجہ سے اسلام نے قرآنی نصوص کے حوالے سے

---

[۱] اس موضوع کی مزید تفصیل کے لیے استاد مرتضیٰ مطہری کی کتاب "وحی و نبوت" ملاحظہ فرمائیں۔ ناشر سازمان تبلیغات اسلامی ایران۔

ساتھ معجزہ دکھانے سے امتناع برتا ہے۔

ان دونوں باتوں پر بحث کرنے کی ضرورت ہے:

پہلی بات:

یہ بات صحیح نہیں ہے کہ انسان کے فکری بلوغ کے دور میں انسان کو معجزے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے قرآن اسے معجزے سے تعبیر نہیں کرتا بلکہ نشانی "(آیہ) سے تعبیر کرتا ہے۔

آیت یعنی نشانی ـــــ کس کی نشانی ـــــ اس بات کی نشانی کہ اس شخص کی باتیں اپنی کہی ہوئی نہیں بلکہ خدا کی کہی ہوئی ہیں۔

ایک وقت ہے کہ ایک پیغمبر لوگوں کے لیے صرف منطقی باتیں کرتا ہے۔ یعنی ایسی باتیں جنھیں اپنے دلائل کے ساتھ جو عملی مسائل کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ دلیل و تجربے اور امتحان کے ذریعے ان کے اثبات کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔

اس صورت میں ہم ایسی باتیں کرنے والے کو کیا نام دیں گے؟

زیادہ سے زیادہ ایک صاحبِ حکمت! ایک بہت بڑا دانشور۔

لیکن حکیم، دانشور، فلسفی اور ایک پیغمبر کے درمیان بہت فرق ہے کسی دانشور اور فلسفی کی باتیں انسانی باتوں کی سطح تک ہیں لیکن پیغمبر اس سے بڑھ کر کہنا چاہتے ہیں۔

انبیاء کی باتیں منطقی اور عاقلانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی رکھتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہماری باتیں ہماری نہیں ہیں بلکہ ہم سے کہی گئی ہیں اور ہم آگے کہہ رہے ہیں۔

"قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ "
یعنی یہ جو میں باتیں کرتا ہوں ایسا نہیں ہے کہ رات کو بیٹھ کر سوچتا رہا یا میرا دماغ دوسروں سے زیادہ بڑا ہے بلکہ یہ تو خدا کی کہی ہوئی باتیں ہیں جو مجھ پر وحی ہوئی ہیں۔

"نزل بہ الروح الامین علی قلبك
لتکون من المنذرین۔

میری ایک زبان ہے جس کا رخ تمھاری طرف ہے لیکن میری روح باطن میں کسی دوسرے سے متصل ہے۔ وہیں سے مجھے بتایا جاتا ہے اور وہی بات میں تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

میں تو دراصل پیغام لانے والا ہوں میں خدا کا پیغام
تم تک پہنچاتا ہوں نہ کہ اپنی باتیں۔

تمام بحث پیغام لانے پر ہے۔

میں رسولؐ اور نبیؐ ہوں۔ یعنی بھیجا گیا ہوں اور
دوسرے کا پیغام پہنچاتا ہوں۔

فرض کریں کہ سقراط یہ کہتا ہے کہ اخلاق کے بارے میں میرا یہ فلسفہ ہے جب ہم سقراط کی بات کو منطقی پائیں گے تو اسے قبول کر لیں گے۔

لیکن اگر سقراط یہ کہے کہ یہ باتیں میری نہیں ہیں بلکہ خدا کا پیغام ہے اور میں خدا کا پیغام آپ تک پہنچا "ہوں تو اس وقت ہم اس سے دلیل مانگیں گے کہ وہ اس دعویٰ کو ثابت کرے۔

اگرچہ اس کی باتیں منطقی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ خدا کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔

کسی بات کا منطقی ہونا الگ مسئلہ ہے اور اس شخص کی نہ ہونا اور خدا کی ہونا اور خدا کی تائید رکھنا اور ان کی اطاعت پر خدا کی طرف سے اجر ملنا اور مخالفت پر خدا کی طرف سے سزا ملنا ایک دوسرا مسئلہ ہے۔

بہت سے لوگ منطقی باتیں کرتے ہیں لیکن اگر ہم ان کی اطاعت نہ بھی کریں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ باتیں میری نہیں ہیں خدا کی ہیں تو اگر ہم اس کی اطاعت نہ کریں تو ہم نے خدا سے گناہ کیا ہے۔ اور اگر ہم نے اس کی اطاعت کی تو خدا کی پرستش کی ہے۔

لہٰذا یہ بات صحیح ہے کہ پیغمبر فکری بلوغ کے عہد میں اپنی باتیں دلیل و منطق کے ساتھ لوگوں کے لیے ثابت کرسکتا ہے۔ یعنی کہتا ہے کہ:

"اے لوگو! تدبر کرو، عقل سے سوچو، میری باتوں کی حقانیت کو پاؤ۔"

لیکن ان باتوں کی حقانیت ایک الگ مسئلہ ہے اور ان کا خدا کی طرف سے ہونا الگ مسئلہ ہے۔

اگر کبھی پیغمبر اسلام یہ کہتے ہیں کہ:

"لوگو! شراب نہ پیو، شراب تمھارے لیے مضر ہے، ناپاک ہے، پلید ہے۔"

اور اس کے بعد لوگوں سے کہتے ہیں کہ:

"اگر تم اس کی دلیل چاہتے ہو تو ان شراب نوشوں کو دیکھو جو بڑے عرصے تک شراب پیتے رہے۔ ان کا کیا حشر ہوا۔ ان کے اعصاب اور معدہ میں کیا کیا خرابی پیدا ہوئی۔

آپ تجربہ کریں جو لوگ شراب پیتے ہیں اور مست ہوجاتے ہیں۔ وہ معاشرے پر کیا مصیبت ڈھاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تجربہ نہیں ہو سکتا۔ شراب نوشی کی وجہ سے جو جرائم پیدا ہوئے ہیں وہ شراب کی خرابی کی دلیل ہیں۔

لوگ اگر عقل اور منطق رکھتے ہیں تو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ حکم منطق پر مبنی ہے اور شراب نہیں پینی چاہیے۔

لیکن پھر یہ بات سامنے آتی ہے کہ کیا یہ خدا کا پیغام ہے ؟ تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ پس فکری بلوغت کے دور میں بھی خواہ پیغمبر کی تمام باتوں کو علمی اور عقلی دلیل کے ساتھ سمجھ لیں۔ تب بھی اگر اس کی رسالت کی تصدیق کرنا مطلوب ہو تو معجزہ کی ضرورت ہے۔

دوسری بات :

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ معترضین کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہؐ قرآن مجید کی شہادت کے ساتھ ہمیشہ معجزہ دکھانے سے اجتناب برتتے تھے۔ اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ انھوں نے کبھی معجزہ دکھایا ہی نہیں۔

اس مدعا کے لیے وہ کچھ آیات پیش کرتے ہیں۔ جن میں سے سب سے واضح سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ہیں۔

" وقالوا لن نؤمن لک .... الا بشرا رسولا۔" (۹۰ — ۹۳)

مکہ ایک بے آب وگیاہ سرزمین ہے۔ مکہ میں اس وقت کوئی رواں پانی نہیں تھا۔ آج کل جتنا رواں پانی ہے اور منیٰ اور عرفات میں اسے استعمال کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر طائف کی نہر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ طائف مکہ کے

جنوب میں بارہ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہارون الرشید جس کے پاس مسلمانوں کا سارا بیت المال تھا اس کی بیوی نے کثیر سرمائے سے پہاڑ کا سینہ چیرا اور طائف سے مکہ تک نہر جاری کی۔ لیکن رسول اللہؐ کے زمانے میں سرے سے مکہ میں پانی دستیاب ہی نہ تھا سوائے آب زم زم کے۔ وہ بھی موجودہ مقدار میں نہیں تھا۔ یہ تو بعد میں مزید کھدائی کے ذریعے پانی زیادہ حاصل ہونے لگا ہے۔

کفار قریش جو کہ رسول اللہؐ کے مخالفین میں سے تھے کہتے تھے۔ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے سوائے اس کے کہ آپ:

(۱) ـــــ زمین سے ہمارے لیے چشمہ جاری کریں۔

(۲) ـــــ چونکہ مکہ میں کوئی باغ نہیں ہے تو یہاں آپ کا ایک باغ ہونا چاہیے جس میں کثرت سے انگور ہوں اور اس کے اندر نہریں جاری ہوں۔

(۳) ـــــ جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں اور دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ قیامت کے دن دنیا الٹ پلٹ جائے گی اور زمین اور آسمان ایک دوسرے میں دھنس جائیں گے۔ تو اب بھی آپ کوئی ایسا کام کریں کہ آسمان ہم پر گر پڑے۔

(۴) ـــــ خدا اور فرشتوں کو آسمان سے اتار کر ہمارے سامنے لائیں تاکہ وہ ہمارے سامنے آپ کی تائید کریں۔

(۵) ـــــ یا آپ دولت سے بھرے گھر کے مالک بنیں۔

(۶) ـــــ یا آسمان پر جا کر وہاں سے ہمارے نام ایک خط لائیں (جس میں آپ کی نبوت کی گواہی ہو)۔

یہ تھیں کفار مکہ کی شرائط ایمان لانے کی۔

" قل سبحان ربی هل کنت الا بشراً
رسولا۔"
" کہو اللہ پاک ہے۔ تم مجھ سے کیا کہتے ہو کیا
میں ایک انسان جو کہ پیغمبر ہے کے علاوہ کوئی
دوسرا ہوں۔"

معترضین آخری جملے سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

" کفار نے چھ قسم کے معجزات کا رسول اللہ سے
مطالبہ کیا۔ رسول اللہ ؐ نے جواب دیا :
سبحان اللہ ! یہ کیا۔ یہ لوگ مجھ سے کس قسم کے
تقاضے کرتے ہیں۔ معجزے کے تقاضے کا کیا مطلب
ہے ؟ میں تمہارے تقاضے پورے کرنے کی
قدرت نہیں رکھتا۔"

یہی وہ آیت ہے کہ جس سے عیسائیوں نے بھی استدلال کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صاحب اعجاز نہیں تھے۔ اور اسی آیت سے بعض روشن خیال مفکرین نے ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ چونکہ پیغمبر اسلام کا تعلق فکری بلوغت کے عہدے تھا اس لیے وہ معجزہ دکھانے سے اجتناب کرتے رہے۔

لیکن یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں اسی لیے ہمیں ان اعتراضات کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ معجزہ کوئی محال کام نہیں ہے۔ محال یعنی ایسی چیزیں جو عقلی طور پر ناشدنی ہوں۔ اگر کسی شخص کے پاس کوئی لامتناہی طاقت ہے تو بھی محال کام ناقابل وقوع ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کام انجام نہیں دے سکتا

بلکہ وہ کام فی نفسہ وقوع پذیر نہیں ہے کیونکہ وہ امر تو محض نیستی ہے جس چیز کی حقیقت عین نیستی ہے وہ ہستی نہیں ہو سکتی۔

پس معجزہ کا تقاضا کسی محال امر کے تقاضے سے الگ چیز ہے۔ کیونکہ معجزہ یعنی وہ امر جو فطرت کے جاری عمل کے برعکس ہو لیکن فی نفسہ ایسا ممکن امر ہے جس کے لیے ماوراء الطبیعی قدرت کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہوئی ایک بات۔

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ سب پیغمبر صاحب اعجاز ہونے چاہئیں تاکہ ان کا معجزہ اس بات کی دلیل بن سکے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔

لیکن کیا عام طور پر انبیاء اس بات کے پابند ہیں کہ جو کچھ لوگ تقاضا کریں وہ پورا کر دیں۔ اگر ایسا ہو تو وہ نبی نہ ہوئے العیاذ باللہ جادوگر ہو گئے۔

جب لوگ تماشہ دیکھنے کے موڈ میں ہوتے ہیں تو پیغمبر کے پاس چلے آتے ہیں اور کہتے ہیں اگر تم پیغمبر ہو تو فلاں کام جو ہم کہتے ہیں کر دو۔

ایک دوسرا گروہ پیغمبر کے پاس آ کر کوئی اور فرمائش کر دیتا ہے ......

یہ تو مذاق ہو گیا۔

پیغمبر صرف اتنے ہی معجزے دکھاتا ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور جونہی اتمام حجت ہو گئی تو لوگ چاہے ہزار بار تقاضا کریں وہ کہہ دیتا ہے کہ:

"اتمام حجت ہو گئی ہے اب مجھ پر لازم نہیں کہ معجزہ دکھاؤں"!

دانشوروں کی تفسیر کے مطابق انبیاء اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ

لوگوں کی فرمائشوں پر عمل کریں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر کسی کا بچہ رو رہا ہے تو وہ دوڑا دوڑا پیغمبر کے پاس آئے اور کہے کہ :

"آپ خدا کے پیغمبر ہیں اور معجزہ دکھا سکتے ہیں
تو ایک ذرا معجزہ دکھا کر اس بچے کو تو چپ
کرا دیں۔"

معجزہ تو اس بات کی دلیل ہے کہ جو آدمی حقیقت کا طالب ہے۔ وہ معجزہ کی مدد سے اس حقیقت کو سمجھ لے کہ یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ اور راست گو ہے اور عمل کرنے پر پابند ہے۔

ایک دوسرا نکتہ جو قابلِ ذکر ہے یہ ہے کہ انبیاء سوداگر نہیں ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ پیغمبر کے پاس آئیں اور کہیں کہ :

"اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تم پر ایمان لائیں تو ہمیں
اتنی رقم دے دو۔"

انبیاء تو اس لیے آتے ہیں کہ لوگ ایمان لائیں۔ ایمان کا تعلق سوداگری سے نہیں ہے۔ انبیاء تو لوگوں کو انفاق کی دعوت دیتے ہیں یعنی وہ چاہتے ہیں کہ خدا کے راستے میں خرچ کریں۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ جب انبیاء انفاق اور جہاد کی دعوت دیتے ہیں تو خود کسی کا انفاق قبول نہیں کرتے۔ مثلاً اگر کوئی شخص پیغمبر کے پاس آکر یہ کہتا ہے کہ :

"میں آپ کے بتائے ہوئے راستے میں خرچ کرنا
چاہتا ہوں۔"

تو جونہی پیغمبر یہ سمجھتا ہے کہ وہ شخص یہ کام خودنمائی کے لیے کرنا چاہتا ہے تو پیغمبر اس کا مال قبول نہیں کرتا۔

یا اگر کوئی شخص آکر یہ کہتا ہے کہ :

"میں اسلام کا سپاہی بننا چاہتا ہوں"

تو پیغمبرؐ اس سے پوچھتا ہے کہ :

"تم یہ کام کیوں انجام دینا چاہتے ہو ؟"

وہ کہتا ہے :

"تاکہ میرا نام تاریخ میں محفوظ ہوجائے ــــ!"

پیغمبر اسے جواب دیتا ہے :

"جاؤ اپنا کام کرو ــ ماھجرت الی اللہ"

"تم نے خدا کی طرف ہجرت نہیں کی ــــ"

تم میں اخلاص وایمان نہیں ہے ۔

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سورہ بنی اسرائیل کی آیات کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے ۔ پہلی آیت میں کہا گیا ہے :

"لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا"

"نُؤْمِنَ لَكَ" اور "نومن بك" کہنے میں بہت فرق ہے ۔

اگر ہم کہیں "یومن بہ" یعنی اس پر ایمان لاتا ہے ۔ اور اگر ہم کہیں :

"یومن لہ"

یعنی اس کے فائدے کے لیے ایمان لاتا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر تم چاہتے ہو ہم تمھاری جماعت میں شامل ہوجائیں تو یہ کام تمھارے مفاد میں ہے ۔ تم بھی ہمارے مفاد کے لیے کام کرو ۔

"حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا"

اس میں " ل " فائدے کے مفہوم کے لیے ہے اور واضح ہے کہ کفار نے چشمہ اپنے فائدے کے لیے مانگا ہے۔

معجزہ کا تقاضا یہ ہے کہ پیغمبر انگوروں اور کھجوروں سے بھرے ایک باغ کے مالک ہوں۔

ظاہر ہے اگر رسول اللہ کا مکہ میں کوئی باغ ہو جس میں کھجوروں اور انگوروں کے ڈھیر سارے درخت ہوں تو وہ یہ میوے فرشتوں کو نہ دیتے مکہ کے ان ہی لوگوں کو ان سے فائدہ حاصل ہوتا۔

یہ بھی معجزے کا تقاضا نہیں ہے بلکہ ایسے امر کا تقاضا ہے جو ان کے اپنے فائدے کے لیے تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ مکہ کو طائف بنا دیں۔ مکہ جہاں نہ کوئی نہر تھی نہ باغ۔ طائف ایسے شہر میں تبدیل ہو جائے جو باغات اور درختوں سے پُر ہے۔

" او تسقط السماء کما زعمت علینا
کسفا۔"

اگر کوئی اس قسم کے معجزہ کا تقاضا کرے کہ پیغمبر سے کہے:

" اگر تم معجزہ دکھا سکتے ہو تو یہ معجزہ کر دکھاؤ کہ مجھے مار ڈالو۔"

کیا یہ معجزے کا تقاضا ہے؟

نہیں۔

کیونکہ جب وہ مارا گیا تو معجزے کا کیا فائدہ

کفار قریش کہتے ہیں کہ:

" اے پیغمبر تم کہتے ہو کہ قیامت میں آسمان گر پڑیگا

اگر سچ کہتے ہو تو ابھی نیچے گرا دو۔"

اگر پیغمبر یہ معجزہ کر دکھاتے تو وہ سب جل مرتے ۔ لہٰذا سب کے جل مرنے سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ۔

"او تأتی باللہ والملٰئکۃ قبیلا ۔"

خدا اور ملائکہ کو ہمارے لیے حاضر کرو تاکہ وہ براہ راست ہم سے بات کریں ۔

ظاہر ہے یہ بھی ایک امر محال کا تقاضہ ہے کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ خدا خود بندوں سے ہم کلام ہو ۔

اگر خدا کسی انسان کی طرح ہوتا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ سکتے اور اپنے کانوں سے اس کی آواز سن سکتے تو پھر پیغمبر کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔

پیغمبر تو ایسے خدا کا تعارف کراتا ہے جو :

"للہ المشرق والمغرب اینما تولوا فثم وجہ اللہ ۔ ھو الاوّل والاٰخر والظاھر والباطن ۔"

وہ جسم نہیں ہے وہ آسمانوں میں نہیں ہے کہ اسے زمین پر منتقل کر دیا جائے ۔ ان کے تقاضے کا مطلب یہ ہے کہ خدا ایک مخلوق کی طرح ہو جائے ۔ یہ بھی صریح محال کاموں میں سے ہے ۔

فرشتوں کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا بھی مادی جسم نہیں کہ ہر انسان انھیں دیکھ سکے ۔ اگرچہ ممکن ہے وہ انسانی صورت میں منتقل ہو جائیں اور بعض افراد کے سامنے نمودار ہوں لیکن فرشتے بنی نوع انسان اور مادہ نہیں ہیں کہ سب انھیں دیکھ سکیں ۔ یہ بھی ایک نامعقول تقاضا ہے ۔

" او یکون لک بیت من زخرف "

یہ بھی ایک مادی تقاضا ہے۔ کفار مکہ اس قدر دولت پرست تھے کہ پیسے کے علاوہ انھیں کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔

آخری مطالبہ یعنی خدا سے خط لانے کا مطالبہ بھی واضح ہے جو ایک بہانہ بازی ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض رسول اللہ خط لے بھی آتے تو کفار یہ کہہ دیتے کہ یہ خط تم نے اپنے پاس سے لکھا ہے۔

بہرحال یہ تقاضے سوداگرانہ اور احمقانہ قسم کے ہیں اور کوئی بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے لہٰذا رسول اللہ ان کے جواب میں کہتے ہیں۔

" میں تو ایک انسان ہوں جو پیغمبر ہے کوئی دوسری
چیز نہیں۔ لہٰذا پیغمبر سے احمقانہ اور سوداگرانہ تقاضا
نہیں ہونا چاہیے "

پس بات اس طرح نہیں جس طرح یہ دانشور سمجھ رہے ہیں کہ یہ تقاضا سابقہ امتوں کے تقاضوں کی طرح تھا جو وہ انبیاء سے کرتے تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام معجزہ دکھانے سے اجتناب کرتے تھے۔

یہ بات غلط ہے۔

اگر کفار مکہ کا تقاضا بھی معقول اور حقیقت پسندانہ ہوتا تو رسول اللہ رد نہ کرتے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر قرآن مجید میں انبیا کے کئی معجزے نقل ہوئے ہیں۔ نوحؑ، لوطؑ، ہودؑ، صالحؑ، موسیٰ، ابراہیم، عیسیٰؑ اور کئی دوسرے انبیاء کے کئی قسم کے کھلے معجزات کا ذکر ہوا ہے جو قابل تردید نہیں ہیں۔

کیا یہ بات معقول تھی کہ رسول اللہؐ قرآن کی زبان سے سابقہ تمام انبیاء

کے معجزات تو بیان کریں لیکن جب ان سے معجزہ طلب کیا جائے تو وہ کہہ دیں کہ میں ایک پیغمبر کے سوا کچھ نہیں ہوں۔

اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہؐ سے اس سوال کی گنجائش باقی رہ جاتی کہ جن اشخاص کے معجزات آپ نے بیان کیے ہیں کیا وہ پیغمبر نہیں تھے یا وہ ان کے معجزات نہیں تھے۔

پس معلوم ہوتا ہے کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جن باتوں کا تقاضا آپ کرتے ہیں وہ معجزات کی قسم میں سے نہیں۔ اگر اس قسم کی ہوتیں تو میں ضرور معجزہ دکھاتا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اگرچہ قرآن خود معجزہ ہے اور یہ بات قرآنی نصوص سے ثابت ہے۔ کیا رسول اللہ کے پاس کوئی دوسرا معجزہ نہیں تھا ــــ؟

رسول اللہؐ کے بعض معجزات کا ذکر خود قرآن نے صراحت کے ساتھ کیا ہے مثلاً ایک رات میں رسولؐ اللہ کو مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے جانا تاکہ خدا انھیں اپنی نشانیاں دکھائے۔

یہ ایک غیر معمولی جسمانی سفر ہے جو رسول اللہؐ نے کیا ــــ کیا یہ معجزہ نہیں ہے۔

اس زمانے میں سب سے تیز رفتار سواری اونٹ تھا۔ جیٹ اور جمبو جیٹ نہیں تھے۔ رسول اللہؐ نے مسجد الحرام سے فلسطین تک ایک رات میں سفر کیا کیا معجزے کے بغیر اس کی توجیہ ممکن ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار قریش نے کہا کہ:

"اس بات کی کیا دلیل ہے کہ آپ نے ایک رات میں سفر کیا۔

رسول اللہؐ نے جواب میں اس قافلہ کی نشانیاں بتائیں جو شام سے مکہ آ رہا تھا کہ وہ قافلہ فلاں مقام پر خیمہ زن تھا اور قافلے والے ایک دوسرے سے یہ گفتگو کر رہے تھے۔ کفار قریش کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہؐ قافلے کے پاس سے گزرے ہیں۔

یا شق القمر کا واقعہ۔ یہ بھی رسول اللہؐ کا معجزہ ہے۔

۶۔ قرآن کا معجزہ

ہم سب کو معلوم ہے کہ ہمارے نبیؐ آخری نبی ہیں اور ان کا لایا ہوا دین بھی آخری اور ہمیشہ رہنے والا ہے بلکہ سابقہ انبیاء سب مقدمہ تھے۔ یعنی ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے اور انسان بھی ان کے مکتب میں ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا تاکہ خود کو آخری مرحلے کے لیے تیار کر سکے۔ کیونکہ آخری دین آنے کے بعد دنیا میں کوئی نیا پیغمبر نہیں آئے گا اور یہ دین مستحکم طور پر دنیا میں باقی رہے گا۔

اب دیکھتے ہیں کہ ختمیت کا راز کیا ہے؟

ہم نے اپنی کتاب "ختم نبوت" (جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے) میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ یہاں صرف ایک بات کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ:

آخری دین دوسرے ادیان سے کئی لحاظ سے مختلف ہے۔ مثلاً آخری دین کی ایک خصوصیت "معجزہ" ہے۔ یعنی اس کا اصلی معجزہ۔

دوسرے انبیاء کے معجزات ایک قسم کے طبیعی واقعات تھے مثلاً مُردہ کو زندہ کرنا ــــــ عصا کا اژدہا بن جانا ــــــ دریا کا راستہ دے دینا وغیر وغیرہ۔

یہ سب وقتی واقعات تھے یعنی ایسے واقعات جو ایک لمحہ میں ایک معین

وقت میں وقوع پذیر ہوئے اور وہ باقی رہنے والے نہیں تھے۔

اگر مُردہ زندہ ہوجائے تو اس کا زندہ ہونے کا عمل ایک لمحے میں انجام پاجاتا ہے۔ ممکن ہے وہ شخص کچھ دن زندہ بھی رہے لیکن آخر کار مرجاتا ہے اور ختم ہوجاتا ہے۔

اگر عصا اژدہا بن جاتا ہے تو یہ ایک ایسا امر ہے جو ایک معین وقت میں پیش آتا ہے اور بعد میں اپنی سابقہ حالت (عصا) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

پہلے انبیا کے معجزات اسی قسم کے تھے بلکہ ہمارے نبیؐ کے بھی بعض معجزات اسی نوعیت کے تھے مثلاً مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ جانا یا شق القمر یہ ایسے معجزات ہیں جو ایک معین رات میں واقع ہوئے اور ختم ہوگئے۔

لیکن ایک ایسے جاوداں دین کے لیے جس کو صدیوں لوگوں میں باقی رہنا ہو ایک مختصر المدت معجزہ کافی نہیں ہے۔ ایسے دین کے لیے جاوداں معجزہ لازم ہے۔

لہٰذا خاتم النبیینؐ کا اصل معجزہ کتاب سے متعلق ہے۔ دوسرے انبیاء بھی کتابیں لائے تھے اور ان کے پاس بھی معجزے تھے لیکن ان کی کتاب معجزہ نہیں تھی اور نہ ہی ان کا معجزہ کتاب تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے پاس توراۃ تھی مگر وہ خود کہتے تھے کہ میری توراۃ معجزہ نہیں ہے میرا معجزہ توراۃ کے علاوہ ہے۔

لیکن پیغمبر اسلامؐ کی کتاب خاص طور پر معجزہ ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس کے علاوہ معجزہ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی کتاب بھی معجزہ ہے اور یہی دین خاتم اور دین جاوداں کا لازمہ ہے۔

آخری دین کے بارے میں ایک اور بات بھی ہے جسے ختمیت کا راز کہنا چاہیے اور وہ یہ کہ ختمیت کا دور سابقہ ادوار کی نسبت آخری اور خصوصی دور ہے۔

یعنی یہ دور انسان کے صاحبِ نظر ہونے کا دور ہے۔

جب ایک طالب علم پرائمری یا ہائی اسکول میں ہوتا ہے تو اسے جو چیز کہی جاتی ہے وہ یاد کر لیتا ہے لیکن جب وہ یونیورسٹی میں جاتا ہے اور کسی خاص مضمون میں ایم۔اے یا ڈاکٹریٹ کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کے صاحبِ نظر ہونے کا دور ہے۔ متعلقہ خاص مضمون میں اجتہاد کا دور ہے۔

آخری دین کا دور بھی انسان کے لیے مجموعی طور پر صاحبِ نظر ہونے کا دور ہے۔ البتہ ایک فرد کا دوسرے فرد کے لیے خاص نقطۂ نظر رکھنا الگ بات ہے۔

انسان کے صاحبِ نظر ہونے کے دور میں ہی دینی مسائل میں اجتہاد اور مجتہد شان پاتا ہے۔

کیا سابقہ ادوار میں بھی مجتہد ہوا کرتے تھے؟

کیا حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے زمانے میں بھی مجتہد تھے؟

نہیں ــــــ!

قرآن میں دین میں فقاہت اور تفقہ کا جو مفہوم ہے وہ کسی بھی طرح دوسرے ادیان میں نہیں تھا۔

وہ کام جو آج مجتہد علم و استدلال اور اجتہاد کی قوت سے کرتا ہے۔ سابقہ انبیاء وہی کام وحی اور نبوت کی قوت سے کیا کرتے تھے۔

اصولی طور پر ان ادیان میں اجتہاد کے لیے زمین ہموار نہیں تھی۔ کیونکہ خود دین میں ایسے قواعد و ضوابط ہونے چاہئیں جن کی بنیاد پر بعض ماہرین جزئی مسائل میں نئے نئے نکتے پیدا کر سکیں۔

سابقہ ادیان چونکہ ابھی ابتدائی اسباق کے زمانے کے مترادف

تھے۔ لہٰذا اصول و ضوابط بیان نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ انسان انھیں سیکھنے کی استعداد نہیں رکھتا تھا۔

ایک اصطلاح ہے پیغمبران مرسل اور غیر مرسل۔

پیغمبران مرسل یعنی ایسے پیغمبر جو صاحب شریعت و قانون ہیں۔ مثلاً:

حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ

اور غیر مرسل پیغمبر یعنی جو دوسرے پیغمبروں کے تابع ہیں اور ان کی شریعت کی تبلیغ کرتے ہیں اور خود ان کے پاس کوئی مستقل شریعت اور قانون نہیں ہے۔

آج کل مجتہدین جو کام کرتے ہیں یہ وہی کام ہے جو غیر مرسل پیغمبر کیا کرتے تھے البتہ مجتہد کا صرف یہی ایک کام نہیں ہے بلکہ وہ اجتہاد کے لیے شرعی حاکم اور عوام کا رہنما بھی ہے۔ وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے منع کرتا ہے۔ وہ امت کے درمیان مصلح ہے اور اس بات کا پابند ہے کہ مفاسد کی اصلاح کرے۔

یہی کام سابقہ ادوار میں پیغمبر کیا کرتے تھے۔ لیکن آخری دین میں اب کوئی پیغمبر محض ان کاموں کے لیے مبعوث نہیں ہوتا۔ بلکہ مجتہدین ہی یہ امور انجام دیا کرتے ہیں۔

یہ ہے اس حدیث کا مفہوم:

"علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل"

میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔"

اشارہ بنی اسرائیل کے ان انبیاء کی طرف ہے جن کا کام صرف

حضرت موسیٰ کی شریعت کی تبلیغ و ترویج کرنا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم سابقہ انبیاء کے دور کو وحی کا دور کہتے ہیں۔ اس مفہوم میں کہ تبلیغ و ترویج کا کام بھی انبیاء ہی کو کرنا ہوتا تھا لیکن آخری دین کے دور میں کچھ کام ایسے ہیں جو تبلیغ و ترویج سے متعلق ہیں یا جزئیات سے کلیات اخذ کرنے کے بارے میں ہیں۔ انھیں علماء انجام دیتے ہیں انبیاء نہیں۔

پس اس لحاظ سے اور ان حدود کے اندر رہتے ہوئے علماء پیغمبروں کے جانشین ہیں لیکن تمام پیغمبروں کے نہیں بلکہ ان پیغمبروں کے جو صاحب شریعت نہیں ہیں۔

اعجاز قرآن کی وجوہات

مجموعی طور پر قرآن کا اعجاز دو لحاظ سے ہے۔ لفظی لحاظ سے اور معنوی لحاظ سے۔

لفظی یعنی فنون اور خوبصورتی کے نقطہ نظر سے

اور

معنوی یعنی فکری اور علمی نقطہ نظر سے

جمال و فن، علم و فکر سے الگ چیز ہے۔ جمال، فن سے متعلق چیز ہے اور علم کا تعلق کشف و ایجاد سے ہے۔

علم یعنی وہ حقیقت جو انسان کے لیے کشف کی جاتی ہے لیکن جمال یعنی وہ چیز جو جمال و زیبائی کی بات پیدا کرتی ہے۔

البتہ خود ہنر و جمال کے بھی مختلف موضوعات ہیں۔ ان میں ایک "سخن" (گفتگو) ہے اور اتفاق سے انسان جس قدر ایک خوبصورت اور فصیح گفتگو

کے سامنے اپنی شیفتگی کا اظہار کرتا ہے کسی اور خوبصورت چیز کے سامنے نہیں کرتا۔

ہم جمال کو دو اقسام پر تقسیم کر سکتے ہیں:

۱) ——— محسوس کیا جا سکنے والا جمال۔

۲) ——— ذہنی جمال۔

محسوس کیا جانے والا جمال بھی سمعی اور بصری حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

باغ اور پھول کی خوبصورتی بصری طریقے سے خوبصورتی ہے اور ایک خوبصورت آواز سمعی طریقے سے محسوس کی جانے والی خوبصورتی ہے۔

کیا بات کی خوبصورتی بھی اسی قسم کی ہے۔

نہیں —!

لہٰذا اصولی طور پر یہ محسوس کی جا سکنے والی خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ محسوسات کے راستے ایک فکری خوبصورتی ہے۔

ایک خوبصورت شعر اور اسی طرح ایک خوبصورت نثر کس قدر انسان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ سعدی (گلستان کے مقدمہ میں) کہتا ہے:

"منت خدائے را عز وجل کہ طاعتش موجب قربت است و بہ شکر اندرش مزید نعمت۔ ہر نفسی کہ فرو می رود ممد حیات است و چون کہ بر آید مفرح ذات۔ پس در ہر نفسی دو نعمت موجود و بر ہر نعمتی شکری واجب۔"

اس کے فوراً بعد یہ شعر لکھتا ہے:

از دست و زبان کہ بر آید
کز عہدہ شکرش بدر آید

اور ساتھ ہی قرآن کی یہ آیت بڑھتا ہے:

"اعملوا آل داود شکرا وقلیل من
عبادی الشکور"

اور کلام جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے:

"فراش باد صبارا گفتہ تا فرش زمردین بگستراند
و دایہ ابر بہاری فرمودہ تا بنات نبات در
مہد زمین بپروراند"

یہ جملے، شعر اور نثر اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ خوبصورتی سے چنے گئے ہیں کہ سعدی کو فوت ہوئے سات سو سال ہو گئے ہیں لیکن گلستان نے خود کو محفوظ رکھا ہے۔

اس نے کیوں خود کو محفوظ کیا ہوا ہے؟

کیونکہ خوبصورت ہے، فصیح و بلیغ ہے۔

قاآنی معروف شعرا میں سے ہے۔ سعدی کا ہم شہر بھی ہے۔ یعنی شیرازی ہے۔ وہ ہمیشہ سعدی کے ساتھ رقابت پر تلا رہا۔ گلستان کی طرز کی ایک کتاب بھی لکھی لیکن سعدی کے مرتبے کو نہ پہنچ سکا۔

منقول ہے کہ سردیوں کی ایک رات تھی۔ شیراز میں کچھ لوگ آگ تاپ رہے تھے۔ گویا ایک ادبی نشست تھی۔ اس محفل میں ایک قوال بھی تھا جس نے سعدی کا یہ معروف شعر پڑھنا شروع کیا:

شبی خوش است و در آغوش شاہد شکرم

جب قوال اس شعر تک پہنچا :

ببند یک نفس ای آسمان دریچۂ صبح
بر آفتاب کہ امشب خوش است با قمرم

قاآنی جو خود شعر شناس تھا یہ شعر سُن کر پھڑک اٹھا اور کہا :

" اگر یہی شعر ہے تو ہم شعر نہیں کہہ سکتے "

پس کبھی کبھی ایک شعر اس قدر خوبصورت نکلتا ہے کہ قاآنی جیسا شاعر جو خود استادِ سخن ہے کسی قوال کے منہ سے سن کر ایسا متاثر ہوتا ہے کہ جب اپنا اس شاعر کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ کس قدر اعلیٰ مرتبے پر ہے اور خود کس قدر اس سے نیچے ہے۔

یہ ہے " بات " کا اثر ۔

حافظ شیرازی کو کس چیز نے محفوظ رکھا ہے ۔ مولوی کو کس چیز نے محفوظ رکھا ہے ۔ صرف ان کے شعروں کی خوبصورتی نے ۔ کیونکہ سخن کی خوبصورتی یا ادبی اصطلاح کے مطابق بلاغت ، فصاحت ، جاذبیت یہ ناقابل انکار مسائل ہیں ۔

جو کوئی سخن شناس ہے اور قرآن کی زبان سے کسی قدر آشنا ہے ۔ حتیٰ کہ وہ یورپی بھی جنہوں نے عربی زبان سیکھی ہے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ

قرآن اپنی فصاحت و بلاغت اور جمال
سخن کے اعتبار سے بے نظیر ہے ۔

اولاً قرآن کا ایک خاص اسلوب ہے ۔ نہ نثر ہے نہ شعر حالانکہ تمام باتیں یا نثر میں ہیں یا شعر میں ۔ لیکن شعر نہیں ہیں ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ

قدیم شعر میں وزن و قافیہ کو شعر کی اصل بنیاد گنا جاتا ہے وہ (قرآن میں) نہیں ہے۔

وزن و قافیہ کے علاوہ شعر کے دوسرے رکن "تخیل" سے بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ مضامین کسی تخیل کے بغیر بیان کر دیے گئے ہیں۔

تخیلات سے مراد وہی مبالغہ آمیز تشبیہات ہیں جو اشعار میں لائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ شعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

"احسن الشعر اکذبہ"

"یعنی بہترین اشعار وہ ہیں جن میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو"

کیونکہ جس قدر زیادہ جھوٹ ہوگا زیادہ خوبصورت ہوگا۔ فردوسی کے اس شعر کی طرح:۔

ز سم ستوران در آن پہن دشت
زمین شد شش و آسمان گشت ہشت

جو کوئی یہ شعر سنتا ہے، سر دھنتا ہے لیکن اس شعر میں کس قدر جھوٹ ہے کہ اس سے بڑا جھوٹ بولا نہیں جا سکتا۔

کیا چند گھوڑوں کے کچھ دیر گرد و خاک اڑانے سے آسمان کے سات طبقوں کی تعداد بڑھ کر آٹھ ہو جاتی ہے اور زمین کے سات طبقوں کی تعداد گھٹ کر چھ۔

یہ بہت بڑا جھوٹ ہے۔ لیکن جھوٹ ہونے کی وجہ سے ہی خوبصورت ہے۔

ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

یا رب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازآن
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

یہ اشعار بہت دل کش ہیں کہ ان میں بہت زیادہ جھوٹ ہے۔ البتہ ہم ایسی مثالوں کو متداول مفہوم میں جھوٹ نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی شرعی لحاظ سے ان پر جھوٹ کا اطلاق ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک ہنر ہے اور بات کو خوبصورت بنانے کا ڈھنگ ہے لیکن قرآن ایسی باتوں کے قریب نہیں گیا۔

اس قسم کے جمال سخن کا امکان بعض خاص موضوعات ہی میں ممکن ہے یعنی کسی کی مدح یا ہجو یا عشقیہ اور رزمیہ اشعار میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن معنویات میں کوئی شاعر ایسا ہنر نہیں دکھا سکا ہے۔

اگر بالفرض شعراء معنویات میں داخل ہونا بھی چاہیں تو چونکہ خود معنی میں ہنر نمائی نہیں کر سکتے۔ معنی کو مادہ کا لباس پہنا دیتے ہیں اور کنایہ کی زبان سے اس معنی کو بیان کرتے ہیں۔

مثلاً شعراء معرفت کی بات کرنا چاہتے ہیں تو اسے "مے" کا لباس پہنا دیتے ہیں۔ جلال ذات حق کی بات کرنا چاہتے ہیں تو اسے " زلف " سے تعبیر کرتے ہیں یا جب وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی ہستی کو اس کے راستے میں کھو چکے ہیں اور مقام فنا فی اللہ تک پہنچ گئے ہیں تو کہتے ہیں:

"خرقہ جائی گرو بادہ و دفتر جائی" وغیرہ وغیرہ۔

لیکن قرآن اصولی طور پر خود ہی معنوی مسائل کو پیش کرتا ہے اور شفاف پانی کی روانی کی طرح بیان کرتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ — الرَّحْمٰنِ

الرَّحِیْمِ - مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ـــ اِیَّاكَ
نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۔

ہر مسلمان پوری عمر ان جملوں کو دن میں کم از کم دس بار نماز میں دہراتا ہے ۔ لیکن ان میں اس قدر شیرینی ہے کہ پڑھنے والا نہ تھکتا ہے نہ سیر ہوتا ہے ۔

پس قرآن شعر نہیں ہے کیونکہ اس میں وزن اور قافیہ نہیں ہے اور نیز یہ کہ اس میں باتیں کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں اور تخیل سے کام نہیں لیا گیا ۔

قرآن نثر بھی نہیں ہے وہ اس لیے کہ کسی نثر میں لَے نہیں ہوتی ۔ مگر قرآن کی نثر میں لَے ہے ۔

کیا آپ کے علم میں کوئی ایسی دینی یا غیر دینی کتاب ہے جسے مختلف الحان میں پڑھا جا سکے ۔

صرف قرآن ہی ایسی کتاب ہے جسے لے کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں اور اب یہ بات ایک علم کے طور پر سامنے آچکی ہے ۔

قرآن کی مختلف آیات مختلف لے مانگتی ہیں ۔ یعنی آیات کے معانی کے مناسب لے ۔ مثلاً اگر کوئی آیت ڈرانے والی ہے تو اس کے لیے ویسی ہی ہیبت طاری کرنے والی لے ۔ اور جو آیات بشارت دینے والی ہیں انھیں ایسے انداز میں پڑھا جائے کہ دل کو آرام بخشیں ۔

آپ عیسائیوں کی وسیع و عظیم دنیا میں چلے جائیں ۔ یہودیوں کی دنیا میں چلے جائیں ۔ اگرچہ ان کا ملک اسرائیل ہے لیکن دنیا کے اکثر ریڈیو اسٹیشنوں ـــ اور دیگر ذرائع ابلاغ پر ان کا قبضہ ہے ۔ کیا آپ نے کبھی انھیں ریڈیو پر انجیل اور تورات کی قرأت کے ساتھ تلاوت کرتے دیکھا یا سنا ہے ۔ اگر وہ ایسا کریں تو یہ تمسخر آمیز ہے ۔ کوئی سننے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتا ۔ کیا سعدی کی نثر ساز و آواز

کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے؟

یہ قرآن کے اسلوب کی خصوصیات میں سے ایک ہے جس کی نہ اس سے پہلے مثال ملتی ہے نہ بعد میں عربی زبان میں دیکھی جاسکتی ہے۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اتنے لوگ حافظ قرآن ہوئے اور وہ قرآن کے ساتھ عشق رکھتے تھے اور وہ خود اپنے عہد کے اولین سخنور بھی تھے مگر قرآن کی طرح کی دو سطریں بھی نہ کہہ سکے۔

حضرت علیؑ کی فصاحت و بلاغت کی ایک دنیا معترف ہے۔ میں نے اپنی ایک دوسری کتاب "سیری در نہج البلاغہ" میں بحث کی ہے کہ حضرت علیؑ کے زمانے اور تقریروں کو ساڑھے تیرہ سو سال گزر چکے ہیں اور ہر زمانے میں عربی زبان کے اول درجے کے ادبا، فصحاء، خطباء گزرے ہیں لیکن حضرت علیؑ کے کلام نے اپنی عظمت محفوظ رکھی ہے۔

حضرت علیؑ نے قرآن کی پہلی آیت یعنی اقرا باسم ربک الذی خلق۔ کو دس یا گیارہ سال کی عمر میں اس وقت سنا جب دوسرے افکار نے ابھی ان کے ذہن پر کوئی نقش نہیں چھوڑا تھا۔ اور حضرت علی وافر حد تک صاحب صلاحیت تھے اور باقاعدگی سے قرآن سے مانوس ہوتے رہے۔ اگر کوئی شخص اس قابل تھا کہ قرآن کی طرح بات کرسکتا تو وہ حضرت علیؑ تھے۔ لیکن اس کے باوجود جب ہم نہج البلاغہ کو قرآن کے پہلو میں رکھتے ہیں تو بخوبی احساس ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف اسالیب کی کتابیں ہیں۔

خود مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے آخری دور میں جب میں قرآن سے بھی آشنا تھا اور نہج البلاغہ سے بھی تو اچانک یہ نکتہ مجھ پر کھلا۔

میں نے نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا اس میں ایک خطبہ ایسا ہے جس میں بہت

سی تشبیہات اور تمثیلات کا استعمال ہوا ہے اور انسان جس قسم کی فصاحت و بلاغت کا استعمال کرسکتا ہے یہ ان سے کہیں زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔

یہ خطبہ سراسر وعظ اور موت اور عالم آخرت کی یاد دلانے والا ہے اور دل دہلا دینے والا خطبہ ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"دار بالبلاء محفوفة وبالغدر معروفة لاتدوم احوالها ولا یسلم نزالها، احوال مختلفة وتارات متصرفة العیش فیها مذموم، والامان منها معدوم، وانما اهلها فیها اغراض مستهدفة ترمیهم بسهامها۔

(خطبہ ۲۲۷)

اس کے فوراً بعد وہ یہ قرآنی آیت پڑھتے ہیں:

" هنالك تبلوا كل نفس ما اسلفت وردوا الی الله مولاهم الحق وضل عنهم ما كانوا یفترون۔

(سورہ یونس آیہ ۳۰)

اگرچہ حضرت علیؑ کا کلام سب سے بلند اور رواں ہے لیکن جونہی درمیان میں یہ قرآنی آیت آتی ہے یوں لگتا ہے جیسے سابقہ کلام پر اوس پڑ گئی ہے اور ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تاریکی کی فضا میں ایک ستارہ ظاہر ہوگیا ہے۔

یہ بالکل ایک الگ اسلوب ہے۔ انسان جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے

بیان نہیں کر سکتا۔

اس آیت میں قیامت کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ قیامت کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کس طرح ان باطل خداؤں کے مقابلے میں ایک خدائے برحق کی طرف لوٹایا جائے گا۔

قرآن کا زمانہ فصاحت و بلاغت کا زمانہ ہے۔ یعنی اس زمانے میں عوام کا ہنر فصاحت و بلاغت تھا۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اس زمانے میں بازار عکاظ ہوا کرتا تھا۔ جہاں حرام مہینوں میں جب جنگ پر پابندی تھی تو یہاں شعر کے فنون کا بازار گرم ہوتا مختلف قبیلوں کے شعراء آتے تھے اور اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ اس بازار میں جو شعر پسند کر کے منتخب کیے جاتے وہ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیے جاتے۔

سات قصیدے جو معلقات سبع کے نام سے معروف ہیں وہ اشعار تھے جن سے بڑھ کر عربوں کی نظر میں کوئی اچھا شعر نہیں تھا۔ وہ مدتوں کعبے میں اپنی عمدگی کی وجہ سے لٹکے رہے۔ لیکن جب قرآن آیا تو ان قصائد کو وہاں سے ہٹا لیا گیا۔

لبید بن زیاد عربی زبان کا ممتاز ترین شاعر تھا۔ قرآن کے نزول کے بعد جب وہ مسلمان ہوا تو اس نے شعر کہنا چھوڑ دیا اور ہمیشہ قرآن پڑھتا رہتا تھا۔

اس سے کہا گیا کہ:

"اب جبکہ تم مسلمان ہو گئے ہو تو کیوں عالم اسلام میں اپنے ہنر سے استفادہ نہیں کرتے اور شعر نہیں کہتے"

اس نے کہا:

"اب میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ اگر سخن یہ (قرآن) ہے
تو ہماری باتیں ہجو ہیں۔ میں اس قدر قرآن سے
محظوظ ہوتا ہوں کہ کوئی دوسری لذت اس سے
بڑھ کر نہیں ہے۔"

زیر بحث آیت میں قرآن نے دعوت دی ہے کہ جو کوئی قرآن کی ایک سورۃ بنا کر لا سکتا ہے، لائے۔ لیکن ایک دوسری آیت میں کہا گیا ہے:

"فلیأتوا بحدیث مثلہ"

"یعنی قرآن کی طرح کا ایک جملہ ایک آیت ہی
بنا کرلے آؤ۔"

لیکن ماضی میں بھی اور اب حال میں بھی قرآن کے اس قدر دشمن پیدا ہونے کے باوجود کوئی بھی اس دعوے کا مثبت جواب نہیں دے سکا۔

موجودہ زمانے میں اگرچہ کچھ لوگوں نے قرآن سے رقابت کا اظہار کرتے ہوئے قرآن کے مقابلے میں کچھ چیزیں پیش کی ہیں لیکن خود انھوں نے دیکھا کہ قرآن اور ان کے بنائے ہوئے جملوں میں کوئی شباہت نہیں ہے۔

پس قرآن کے معجزات میں سے ایک معجزہ اس کا ہنری پہلو ہے۔ یعنی اس کا فصیح و بلیغ ہونا۔ البتہ قرآن کے لیے یہ اصطلاحات صحیح مفہوم کو بیان نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ فصاحت کا مطلب ہے روشنی اور بلاغت کا مطلب ہے (مفہوم کی) رسائی اس قسم کی اصطلاحات مقصود بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ہمیں ان کے ساتھ ایک اور اصطلاح "جاذبیت" کا بھی اضافہ کرنا چاہیے۔ جو قرآن کی دلکشی کا اظہار کرے۔ کیونکہ قرآن ایک خاص طرح

سے دلوں پر اثر کرتا تھا اور اپنی خاص دل کشی کی بنا پر عجیب سرعت سے دلوں کو تسخیر کرتا تھا۔

کفار کو جو آنحضرتؐ کو جادوگر کہتے تھے یہ بالواسطہ طور پر اعتراف تھا کہ وہ قرآن کا مثل نہیں لا سکتے۔ یہ قرآن کی جاذبیت کی وجہ ہی سے ہے۔ جب کفار دیکھتے کہ کوئی غیر معتقد شخص ایک دو بار قرآن سنتا ہے اور مسحور ہو جاتا ہے تو کہتے:

"یہ جادوگر ہے۔"

باہر کے جو لوگ مکہ آتے تھے جب مسجد الحرام کے طواف کے لیے جاتے تو مشرکین انھیں تاکید کرتے کہ کانوں میں روئی ٹھونس کر وہاں جائیں۔ مبادا وہ شخص (حضرت محمدؐ) جس کی باتوں میں جادو ہے آپ پر جادو کر دے۔ اس کی آواز تمھارے کانوں میں نہیں پہنچنی چاہیے اس سے بچانے کے لیے کفار ایسے نوواردوں کو روئی مہیا کرتے۔

اتفاق سے مدینہ سے ایک سردار مکہ آیا ہوا تھا اور ایک مکی اسے بھی نصیحت کر رہا تھا۔ وہ مدنی سردار خود کہتا ہے کہ:

"میں نے کانوں میں اس طرح روئی ٹھونس لی کہ اگر میرے سر پر ڈھول بھی پیٹا جاتا تو اس کی آواز نہ سُن سکتا۔ روئی ٹھونس کر میں مسجد الحرام میں آ گیا اور طواف کرنا شروع کر دیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص عبادت میں مشغول ہے۔ اس کے چہرے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔

لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے
میں نے محسوس کیا کہ یہ وہی شخص ہے۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ کیا بات تھی جو مکہ کے
سردار نے مجھ سے کی تھی۔ میں کیوں اس کی بات
مانوں۔ بہتر یہ ہے کہ میں کانوں سے روئی نکال
کر سنوں کہ یہ آدمی کیا کہہ رہا ہے۔ اگر کوئی معقول
بات کر رہا ہے تو مان لوں گا ورنہ اس کے کہنے میں
نہیں آؤں گا۔
میں نے کانوں سے روئی نکالی اور اس کے پاس
گیا اور اس کی باتیں سنیں۔ وہ آہستہ آہستہ قرآن
کی آیات پڑھ رہا تھا۔ میں نے سنا۔ میرا دل
نرم ہو گیا کہ سرتاپا اس شخص پر شیفتہ اور عاشق
ہو گیا۔"

بعد میں مدینہ کا یہی شخص تاریخ اسلام کا ایک معتبر شخص بن کر سامنے آتا ہے یہ ان افراد میں سے ایک ہے جس نے رسول اللہؐ کی مدینہ ہجرت کے لیے زمین ہموار کی۔ مدینہ میں اسلام اور رسول اللہؐ کی ہجرت کی بنیاد اسی ملاقات میں رکھ دی گئی تھی لے۔

لے یہ اسعد بن زرارہ اور ذکوان خزرجی تھے جو اپنے قبیلہ کی طرف سے قبیلہ اوس کے ساتھ جنگ کے سلسلے میں ایک فوجی معاہدہ کرنے مکہ آئے تھے۔ لیکن ایمان کی دولت لے کر مدینہ لوٹے اور رسول اللہ کی مدینہ ہجرت کے لیے راستہ ہموار کیا۔

یہ قرآن کی دلربائی اور اصطلاحاً خوبصورتی اور ہنر کا اثر تھا۔

ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ قرآن کا معنوی اثر اسلامی ادب پر بڑھتا گیا۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صدر اسلام یعنی پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اگرچہ عربی ادب موجود تھا لیکن ابھی قرآن نے اس قدر اپنے اثرات ظاہر کرنا شروع نہیں کیے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے۔ قرآن کے اثرات ادب پر بڑھتے جا رہے ہیں۔

فارسی کے مسلمان شعراء پر ایک نظر ڈالیں۔ "رودکی" تیسری صدی ہجری کا شاعر تھا۔ اس کے اشعار محض فارسی ہیں۔ ان پر قرآن کا اثر بہت کم نظر آتا ہے لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اور فردوسی کے زمانے اور بعد کے ادوار کے شعراء پر نظر ڈالتے ہیں تو قرآن کا اثر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

جب ہم چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں یعنی مولوی کے عہد میں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مولوی قرآن کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا۔ جو کچھ کہتا ہے قرآن کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ البتہ تصوف کے نقطۂ نظر سے حالانکہ معاملہ اس کے الٹ ہونا چاہیے۔ یعنی کسی ادب کو اپنے عہد میں زیادہ متاثر کرنا چاہیے بہ نسبت ایک دو صدی بعد۔

یہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں ایک مختصر بات تھی لیکن قرآن کے اعجاز کا دوسرا پہلو معنویت میں ہے۔

اگر ہم الہیات کے مباحث قرآن میں دیکھیں۔ معاد اور سابقہ انبیاء کے بارے میں قرآن کی منطق ملاحظہ کریں۔ یا فلسفہ اخلاق اور فلسفہ تاریخ کے بارے میں قرآن کی منطق کا مطالعہ کریں تو بخوبی ہم قرآن کے دلائل کی عظمت کو پالیں گے۔

یہ ہیں وہ مسائل قرآن جن کا ابلاغ کرتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن طب کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی انجینئری کی کتاب ہے بلکہ ایسی کتاب ہے جس کا کام لوگوں کو ہدایت دینا ہے۔

قرآن کے اعجاز کے اور بھی پہلو ہیں۔ مثلاً غیب کی خبریں دینا یا غیبی پیشگوئیاں کرنا اور ان کا آپس میں ہم آہنگ ہونا۔

یہ سب موضوعات تفصیل طلب ہیں اگر عمر باقی رہی تو بحث کروں گا۔[1]

---

[1] صد افسوس کہ مرحوم مطہری کو یہ فرصت میسر نہ ہوئی اور ۱۹۷۹ء میں ایران میں اسلامی انقلاب آگیا اور انھوں نے اپنا تمام وقت اس انقلاب کی پیش رفت کے لیے وقف کردیا۔ اور آخر کار ان کی دیرینہ آرزو یعنی شہادت در راہ حق" پوری ہو گئی۔

امیر المومنین
حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام
نے فرمایا :

○ —— قرآن ایسی دوا ہے جس کے بعد کوئی درد نہیں ہوتا۔
○ —— یہ وہ روشنی ہے جہاں اندھیرے کا گزر نہیں۔
○ —— جو اس کا ساتھ دے گا عزت پائے گا۔
○ —— جو اس میں داخل ہوگا محفوظ رہے گا۔
○ —— جو اس کی اتباع کرے گا اسے ہدایت و نجات ملے گی۔
○ —— یہ رہنما ہے اس کے لیے جو سوچ و بچار کرتا ہے۔
○ —— جس کو بوجھ اٹھانے والا درکار ہو اس کے لیے — بارکش ہے۔
○ —— اور ڈھال ہے اس کے لیے جو ہتھیار بند ہو۔
○ —— علم ہے —— عالم کے لیے۔
○ —— حدیث ہے —— راوی کے لیے۔
○ —— فیصلہ ہے —— قاضی کے لیے

انشراح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ
وِزْرَكَ ۝ الَّذِىٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا
لَكَ ذِكْرَكَ ۝ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ
الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى
رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

اس سورہ مبارک "انشراح" کے مخاطب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں۔ اس سورت کے تین حصے ہیں:

پہلے حصے کا تعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ہونے والی عنایات

ربانی والطافِ الٰہی کی یاد دہانی سے ہے۔

دوسرے حصّے کا تعلق ایک طرح کی تعلیم یعنی ایک خاص بات کا بیان کرنا اور اس کی جانب توجہ دلانا ہے۔

اور تیسرے حصے کا تعلق نتیجہ اخذ کرنے سے ہے۔ سورہ " والضحیٰ " جو اس سے پہلے کی سورت ہے۔ اس سورت کے تین جملے اور سورۃ انشراح کے چار جملے ایک ہی سیاق سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تین جملے یہ ہیں۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ○ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ○ [1]

یعنی اے پیغمبرؐ یاد کرو اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کو جو اس نے تم پر کیے ہیں۔ اس کے بعد یہ تین جملے آتے ہیں:

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○ [2]

گویا کہ الم نشرح لک صدرک کا جملہ الم یجدک یتیماً فاویٰ کا عطف ہے اسی لیے بعض شیعہ اور سنّی مفسرین کا موقف یہ ہے کہ سورہ الم نشرح اور سورہ والضحیٰ ایک ہی سورت ہیں نہ کہ دو سورتیں اور ایک دوسرے سے الگ الگ

---

[1] کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمھیں ناواقف پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمھیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا۔

[2] لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو اور اپنے رب کی عظمت کا اظہار کرو۔

حتیٰ کہ روایات میں آیا ہے، نماز واجب میں حمد کے بعد ایک پوری سورت پڑھنا لازم ہے۔ اہل تسنن پوری سورت کو لازم نہیں سمجھتے۔ بلکہ سورت کے ایک حصے بلکہ ایک چھوٹی آیت کو کافی سمجھتے ہیں۔ عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں ائمہ جماعت اکثر اوقات قرآن میں سے کسی بھی جگہ سے کسی سورت کے درمیان سے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ سات، آٹھ یا دس آیتیں پڑھتے ہیں اور اسی مقام پر قرائت ختم کر دیتے ہیں لیکن فقہ شیعہ کی رو سے حمد کے بعد ایک پوری سورت کا پڑھنا لازم ہے۔ اسی لیے فقہا کو اس امر میں شبہ رہا ہے کہ سورۂ "والضحیٰ" یا سورۂ "انشراح" کو الگ اکیلے پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح سورۂ "فیل" اور سورۂ "لایلاف قریش" کے بارے میں بھی یہی سوال زیر بحث رہا ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی سورت ہیں یا الگ الگ دو سورتیں ہیں۔ اس وقت یہ مسئلہ سورت کی تفسیر سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔

"اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ"

اس آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟"

شرح صدر کے الفاظ قرآن مجید میں مختلف انداز میں بار بار آتے رہے ہیں۔ موسیٰ ابن عمران کو جب اللہ تعالےٰ نے منصب رسالت پر مبعوث فرمایا اور انھیں وَاذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ کا حکم دیا (یعنی فرعون کی طرف جا) تو موسیٰؑ نے خدائے تعالیٰ سے جو چیز سب سے پہلے مانگی وہ "شرح صدر" تھی۔

... رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ○
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ○
وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ○ هٰرُوْنَ اَخِی ○
اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ○ وَاَشْرِکْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ○
کَیْ نُسَبِّحَکَ کَثِیْرًا ○ وَّنَذْکُرَکَ کَثِیْرًا ○ اِنَّکَ
کُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ○ [1]

موسیٰؑ نے درخواست کی اے اللہ اب کہ تو نے میرے کمزور شانوں پر اپنی رسالت کا اور ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ رکھ دیا ہے تو میرے سینے کو کھول دے اور مجھے شرح صدر عطا فرما۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ
صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ

---

[1] موسیٰؑ نے عرض کیا پروردگار میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں اور میرے لیے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کردے۔ ہارون جو میرا بھائی ہے اس کے ذریعے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کردے۔ تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے۔

يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ ^۱

اس آیت کے پہلے حصّے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالےٰ نے ہدایت دینا چاہتا ہے اور ہدایت کے لیے اس شخص نے کوئی استحقاق پیدا کیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ یہاں پر خاص طور سے للاسلام کے الفاظ فرمائے گئے ہیں۔

پہلی آیت جو میں نے پڑھی تھی اس کا تعلق خود پیغمبرؑ کی ذات سے تھا اور آیت "رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ" میں موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ایک سوال اور تقاضا کیا گیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ایک شرح صدر مانگ رہے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ شرح صدر کا معاملہ صرف پیغمبر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے ایک ایسی چیز مانگتے ہیں جو ہر مانگنے والے کو ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ وہ انھیں عطا فرماتا ہے۔ شرح صدر صرف انبیاء کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ جس شخص کو بھی اسلام کی طرف ہدایت ہوئی ہو اور جس شخص کے دل پر بھی اسلام کا نور چمکا ہو اُسے فی الواقع شرح صدر عطا ہوا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ "شرح صدر" کیا ہے۔؟ ہم پہلے "صدر" کا معنیٰ و مطلب

---

^۱ دلیل یہ حقیقت ہے کہ جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔

معلوم کریں گے اور پھر "شرح" کا مطلب بھی۔

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے نہیں کھول دیا؟"

یا موسیٰؑ کہتے ہیں:

"یا اللہ میرے سینے کو کھول دے۔"

یا ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ سارے مومنین کے لیے فرماتا ہے:

"جس کسی کو اللہ تعالیٰ اسلام کی طرف ہدایت فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو کھول دیتا ہے۔"

کیا اس سے سینے پر کیا جانے والا کوئی خاص مادی عمل مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے یہ کنایہ ہے۔ "شرح صدر" انسان کے ظاہری سینے پر کسی عمل کا نام نہیں ہے، یہاں "صدر" سے مراد انسان کا 'قلب' ہے اور ظاہر ہے قلب سینے ہی میں ہوتا ہے اور جب قلب کی بات کی جاتی ہے تو خود قلب بھی کنایہ ہے۔ اس حقیقت کے لیے جو انسان کے قلب سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی انسان کی روح، انسان کا نفس۔ مراد انسان کے قلب کو کھولنا بھی نہیں ہے۔ اب شرح کے جو بھی معنیٰ کیے جائیں اور صدر کے جو بھی معنیٰ کیے جائیں یہ شرح کا عمل ایک امر روحی او امر معنوی ہے نہ کہ ایک امر مادی و امر جسمانی۔

اب ہم لفظ "شرح" کے معنیٰ و مطلب معلوم کرتے ہیں۔ عموماً مفسرین یا مترجمین 'شرح صدر' کے معنیٰ "سعہ صدر" کرتے ہیں۔ سعہ صدر یعنی سینے کا کشادہ ہونا۔ عربی زبان کا یہ ایک مخصوص انداز بیان ہے۔ حدیث میں بھی سعہ صدر کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً:

"آلَۃُ الرِّیَاسَۃِ سَعَۃُ الصَّدْرِ"

یعنی ریاست و سربراہی سعہ صدر ہے ۔ یہاں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ لفظ سعہ کے معنیٰ کشادگی کے ہیں لیکن مراد یہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی چوڑا چکلا پہلوانوں کا سا سینہ رکھتا ہے وہ سعہ صدر بھی رکھتا ہے ، یا یہ کہ اگر کوئی شخص دبلا پتلا ہے تو وہ سربراہی کا منصب نہیں رکھتا ۔ سعہ صدر کا مطلب بلند حوصلہ اور زیادہ ہمت رکھنا ہے ۔ یہ در اصل حوصلہ مندی اور وسعت ظرف کے لیے کنایہ ہے ۔

یعنی اگر کوئی شخص سربراہ بننا چاہتا ہے اور لوگوں سے سروکار رکھنا چاہتا ہے اور لوگوں کی بڑی تعداد پر حکومت کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہوگی کہ وہ بڑے وسیع حوصلے کا مالک ہو ۔ کم حوصلہ ، تند مزاج لوگ اور جلدی ناراض ہوجانے والے لوگ کسی ادارے کے سربراہ اور رئیس نہیں بن سکتے اور کسی بڑی جماعت کو کنٹرول نہیں کر سکتے ۔ خواہ کسی طرح کی بھی سربراہی ہو ۔ آپ ذرا ایک مدرسے کے پرنسپل کو لے لیجیے یا ایک جماعت کے کلاس ٹیچر ہی کو دیکھیے ۔ اگر وہ ایک کم حوصلہ آدمی ہوگا تو وہ اسے کنٹرول نہیں کر سکے گا ۔

اگر کوئی شخص اپنے خاندان کی سربراہی کرنا چاہتا ہے ۔ اسے بھی سعہ صدر کا حامل ہونا چاہیے ۔ یعنی حوصلہ مند ہونا چاہیے ۔ انسان کی ذمہ داری جس قدر زیادہ ہوگی ۔ اسی قدر اس کا سعہ صدر یا حوصلہ بھی زیادہ ہونا چاہیے ۔ عموماً مفسرین نے اس کلمہ کے یہی معنیٰ کیے ہیں کہ اللہ تعالٰے نے پیغمبرؐ کو اپنا یہ احسان یاد دلایا ہے کہ اُسے یہ سربراہی ، یہ حوصلہ مندی اور یہ سعہ صدر عطا کیا گیا ۔

اے پیغمبر ! کیا ہم نے تمھیں یہ سعہ صدر ، اور روحانی
عالی ظرفی عطا نہیں کی ؟

یعنی ہم نے تمھیں عطا کی لیکن " شرح صدر " اور کلمہ " سعہ صدر " میں ایک فرق ہے ۔ جس کسی کو شرح صدر ملے گا اسے " سعہ صدر " بھی حاصل ہوگا لیکن حصر

اسعہ صدر' کو' شرح صدر' نہیں کہا جا سکتا۔

قرآن " اَلَمْ نَسَعْ لَكَ صَدْرَكَ " بھی کہہ سکتا تھا۔ وہ سعہ کا لفظ استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن قرآن نے " اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ " کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو اپنے رسولؐ تک پہنچایا۔

شرح کے معنی کیا ہیں؟

شرح کے وہی معنی ہیں جو عام طور پر رائج ہیں مثلاً کوئی شخص ایک کتاب لکھتا ہے۔ جس کے متن کی حیثیت ایک خلاصے اور معلومات کے نچوڑ کی سی ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے خلاصے کا مطالعہ کرے گا تو وہ لکھنے والے کے مقصود اور مراد کو تمام جزئیات کے ساتھ نہیں سمجھ سکے گا۔ اب ایک دوسرا شخص اٹھتا ہے اور اس کتاب کی شرح لکھ دیتا ہے۔ کتاب کے ایک ایک نکتہ کی وضاحت کرتا ہے۔ اس خلاصے میں جو بات ایک سطر میں بیان کی گئی، اس کی وضاحت وہ پورے ایک صفحے میں کرتا ہے۔ جو لوگ بہت گہری فکر رکھتے ہیں ایک ایسی جامع اور مختصر کتاب کی شرح بیان کر سکتے ہیں۔

خواجہ نصیر الدین طوسی نے "تجرید الاعتقاد" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو علم کلام کے بارے میں ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں "تجرید المنطق و تجرید الاعتقاد"۔ خواجہ کو ایک طرف تو متکلمین کے نظریات پر پورا عبور حاصل تھا اور دوسری طرف فلاسفہ کے نظریات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان دونوں مشکل موضوعات پر پوری قدرت رکھنے کے ساتھ وہ خود ایک صاحب نظر محقق ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب قلم برداشتہ لکھی ہے۔ یہ بات تقریباً کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے کلامی مسائل اور فلسفیانہ مسائل کی بنیادی باتوں کو مختصر اور چھوٹی عبارتوں میں بیان کیا ہے۔

بعد میں ان کے شاگرد 'علامہ حلی' نے جو خود ایک عبقری گزرے ہیں اس کتاب کی شرح لکھی۔ خواجہ ایک فلسفی اور ریاضی دان تھے جبکہ علامہ حلی ایک فقیہ تھے اور ایک جامع العلوم شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی اس شرح کا نام "کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد" رکھا۔ البتہ ان کی یہ شرح بہت مفصل نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے پہلی بار اس کتاب کے مطالب کو واضح کیا۔

علامہ حلی عرب ہیں اور خواجہ نصیر الدین طوسی ایرانی ہیں۔ خواجہ نے چھ سات سو سال قبل یہ کتاب تالیف کی تھی۔ تین سے چار صدی قبل ابھی میرداماد اور ملاصدرا کا دور شروع نہیں ہوا تھا اور خواجہ کے اکثر افکار کو بڑی ترویج واشاعت حاصل ہو چکی تھی۔ ان کی کتاب کی اس قدر شرحیں لکھی گئیں اور اس پر اتنے حاشیے لکھے گئے اور پھر شرحوں پہ شرحیں اور حاشیوں پر حاشیے لکھے گئے کہ دنیائے اسلام میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو کہ جس کے بارے میں اس قدر کھلبلی مچی ہو۔

جو بھی عالم آیا اس نے اس کتاب کے مسائل سے متعلق مختلف پہلوؤں پر مسلسل بحث کی۔ شاید ایک سو سے زیادہ افراد نے اس کتاب کی شرحیں لکھی ہیں اور حاشیوں پر حاشیے لکھے ہیں۔

بعد میں آنے والوں نے کہا کہ:

> یہ شخص علامہ حلی عرب ہے اور شیعہ ہے۔ جبکہ
> بہت سے سنیوں نے کتاب کی شرحیں لکھی ہیں
> اگر یہ شخص عرب نہ ہوتا اور اس کتاب کی پہلی
> بار شرح نہ لکھتا تو کوئی شخص اس اونٹ کے
> بارے میں نہ جانتا کہ وہ کس کا ہے اور کدھر جا رہا ہے؟

یہ وہ کام ہے جس کا نام 'شرح' رکھا گیا ہے۔

یسا ہی معاملہ اشعار کا ہے۔ کبھی ایک شعر کی شرح کے لیے پوری ایک کتاب درکار ہوتی ہے۔ لیکن ہر شاعر ایسا شعر نہیں کہہ سکتا کہ اس کی شرح میں ایک پوری کتاب لکھنے کی ضرورت پڑے۔ بعض ایسے ممتاز شعراء ہیں کہ ان کا ایک شعر ایک پوری کتاب کا مطلب اپنے اندر لیے ہوتا ہے۔ مثلاً مولوی، حافظ۔ یہ بڑی عالم شخصیتیں تھیں۔ اپنے زمانے کے علوم و معارف پر انھیں پورا عبور تھا۔ اس کے ساتھ سخن و بیان پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ بڑے بڑے علماء نے حافظ کے ایک ایک شعر پر پورے رسالے لکھے ہیں اور ان اشعار کی شرح بیان کی ہے۔ اسی طرح مولوی کے بعض اشعار پر رسالے لکھے ہیں اور اپنی کتابوں میں ان اشعار کی تشریح کے لیے فصلیں مخصوص کی ہیں۔

حیرت اندر حیرت آمد در قصص
بے ہوشی خاصگان اندر اخص

عقل اول راند بر عقل دوم
ماہی از سر گندہ گردد، نی زدم

"ماہی از سر گندہ گردد، نی زدم" چوتھے مصرع میں استعمال ہونے والی یہ کون سی کہاوت ہے اور اب یہ کس مفہوم کے لیے بیان کی جا رہی ہے؟

توضیح کے اسی عمل کو شرح کہتے ہیں۔ یہ قصاب کی طرح کا عمل ہے۔ قصاب گوشت کے ایک ٹکڑے کو لے کر اس کے نازک پردوں کی اس طرح تراش خراش کرتا ہے کہ وہ چاہے تو پورے کمرے کے فرش کے برابر پھیل سکتا ہے۔ اسی طرح شارح ایک گتھی ہوئی اور مختلف پہلوؤں کے ساتھ جڑی ہوئی بات کو کھولتا اور اس کی تفصیل سے وضاحت کرتا ہے۔ شرح صدر کا مسئلہ دراصل ایک روحانی مسئلہ ہے۔ دنیا میں کوئی چیز انسان کی روح کے برابر شرح کی محتاج نہیں ہے۔

اتزعم انک جرم صغیر

وفیک انطوی العالم الاکبر

" ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے اندر
ایک دنیا لیے ہوئے ہے"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" کیا ہم نے تمھارے سینے کو کھول نہیں دیا؟ "

اللہ تعالیٰ نے محض یہ بات نہیں فرمائی کہ ہم نے تمھارے باطن کو وسعت دے دی۔ جیسے کہ ایک چھوٹا گھر ہے سو میٹر کا۔ اس کے بعد آپ سو میٹر کی زمین مزید خرید لیتے ہیں۔ اس صورت میں آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے گھر کو وسعت دے دی ہے۔

جس حال میں اور جس جگہ بھی 'شرح' میسر آئے گی وہاں لازماً 'وسعت' بھی ملے گی لیکن جہاں 'وسعت' ملے گی وہاں 'شرح' کا بھی ملنا لازمی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض یہ بات کہنی نہیں چاہی کہ ہم نے تمھاری روح کو سعۂ صدر عطا کی ہے۔ جیسے کہ کسی زمین کو وسعت دی جائے یا کسی برتن کو بڑا کر دیا جائے۔

بات یہ کہی گئی ہے کہ اس بڑے برتن کو ہم نے ایک اور طرح سے کھول دیا ہے۔ ہم نے تمھاری روح کو کھول دیا ہے۔ ہم نے اس روح کے تہہ بہ تہہ صفحات کو تیرے لیے کھول دیا ہے۔ اسی بنا پر 'شرح صدر' میں 'سعۂ صدر' خود موجود ہے۔ لیکن ہر 'سعۂ صدر' کو 'شرح صدر' نہیں کہا جا سکتا۔ جب کہ ہر 'شرح صدر' میں 'سعۂ صدر' کا ہونا لازمی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ شرح صدر انسان کے لیے باعث سعادت ہے

یا نہیں ؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ

يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ج

یعنی اللہ تعالیٰ جس کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے اور حقائق اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کہ کر اللہ تعالیٰ نے گویا یہ فرمایا ہے :

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ لِلتَّوْحِيْدِ

یا :- اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ لِلْاِسْلَامِ ج

کیا ہم نے تمھارا سینہ توحید کے لیے نہیں کھول دیا ؟

کیا ہم نے تمھارا سینہ اسلام کے لیے نہیں کھول دیا ؟

یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص کفر کے لیے شرح صدر حاصل کرے !

ایک عام آدمی کی مثال لیجیے ۔ اسے شرح صدر حاصل نہیں ہے ۔ نہ اسلام کے لیے نہ غیر اسلام کے لیے اور نہ کفر کے لیے ۔ لیکن افسوس کہ وہ شرح صدر پیدا کرتا ہے ، ایک طرح کا روحانی اور معنوی جذبہ پیدا کرتا ہے ۔ لیکن کس چیز کے لیے ، کفر کے لیے ۔ تو کیا وہ کفر ہی کی سمت سے صدر پیدا کرے گا ؟

جی ہاں :

وہ شرح صدر کی اس صلاحیت کو کفر کے راستے پر بڑھنے اور کفر کی سمت چلنے کے لیے استعمال کرے گا ۔

اس کی بڑی اچھی مثال اس شخص کا حال ہے جو کسی روزنامے میں شائع

ہوا تھا اور میں نے اسے پڑھا تھا :

تیمورتاش نے کسی وقت آقا میرزا طاہر تنکابنی سے کہا تھا کہ :

" میں نے خدا کے موجود نہ ہونے پر ستر دلائل جمع کیے ہیں "

اس پر میرزا نے اس سے کہا تھا :

" میرے پاس اس بات کی بھی ایک دلیل ہے کہ خدا نہیں ہے ۔

تیمورتاش نے پوچھا :

" وہ کیا دلیل ہے ؟ "

میرزا نے جواب دیا :

" تجھے اس وقت بڑی آسائشوں کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہے ۔ اگر خدا ہوتا تو کسی روز تیرا حساب کتاب ضرور کرتا ! "

بعد میں اس پر ایسا دور آیا کہ وہ جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ اب اس کی تمام امیدیں منقطع ہوگئیں ۔

اس تماشے کے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے نہ ہونے پر دلائل رکھتے ہیں ۔ ان کے یہ دلائل سب دھوکہ اور فریب ہیں ۔

ان ہی جناب کی ایک فرنگی بیگم تھیں جیل کے حکام نے اس خاتون کو ملاقات کے لیے آنے کی اجازت دے رکھی تھی ۔ اور وہ اپنی بیگم سے کہا کرتا :

" شہر کے جنوبی حصے میں ایک دعا نویس رہتا ہے تم اس دعا نویس کے پاس جاؤ اور اس سے ایک دعا کا تعویذ حاصل کرو "

یہ وہی شخص ہے جو کبھی کہتا تھا کہ میں خدا کے موجود نہ ہونے پر اپنے پاس ستر دلیلیں رکھتا ہوں لیکن اب اسے کسی دعا نویس کی تلاش تھی۔ یہی وہ چیز ہے جسے کفر کے لیے شرح صدر کا حاصل ہونا کہتے ہیں۔

فخرالدین رازی کے بارے میں یہ جسارت میں نہیں کرسکتا کہ انھیں اس طرح کے لوگوں کی صف میں جگہ دوں تاہم وہ مرد حقیقت نہیں ہیں۔ ایک اعتبار سے انھیں فی الواقع شرح صدر حاصل ہے۔

کس طرح کی شرح صدر؟

یعنی جب بھی وہ کسی موضوع کو زیر بحث لاتے ہیں خواہ اس موضوع کا تعلق کلام سے ہو، فلسفہ سے ہو یا تفسیر سے ہو۔ کیا خوب تشریح کرتے ہیں! مثلاً ایک قرآن کی آیت کی انھوں نے تفسیر لکھی ہے۔ اس آیت قرآنی کی بیس[۲۰] تفسیریں ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے ان سب کو بیان کرتے ہیں۔ کسی جن کی عقل بھی ایسا نہیں کرسکتی۔!

مولوی فرماتے ہیں:

فخر رازی علم را لیکی کند
پیش مرغاں ریزد و تی تی کند

"فخر رازی علم کو جمع کر کے اسے بکھیرتے ہیں پرندوں کے سامنے ڈالتے ہیں اور پھر انھیں چگنے کی دعوت دیتے ہیں۔"

فی الواقع ایسا ہی ہے۔ لیکن آخر میں جب ان مختلف تفسیروں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے اور ترجیح دینے کا مسئلہ آتا ہے تو وہ آخر کار ایک ایسے نظریہ کو منتخب کرتے ہیں جو فی الواقع ایک انسان کے لیے مضحکہ خیز

ہوتا ہے۔ رازی ایک طرح کا شرح صدر رکھتے ہیں لیکن ان کے اس شرح صدر کے ساتھ ہدایت خداوندی نہیں ہوتی۔

ایک عام آدمی کے لیے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ ادھر ادھر جانے کی بجائے پہلے ہی مبنی بر حقیقت مطلب کو پالے لیکن جب وہ چالیس راستوں میں سے کبھی ایک راستے کی طرف جاتا ہے اور کبھی دوسرے راستے کی طرف اور آخر میں جس راہ پر جانا چاہیے تھا اسے چھوڑ کر بلکہ اصل راستے سے ہٹ کر چلنا شروع کر دیتا ہے تو اس کی حالت بخوبی ظاہر ہے۔

نجم الدین کبری بڑے عارفین میں سے ایک ہیں۔ ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ شخص خود محسوس کرتا تھا اور کہتا تھا:

"میرے پاس جو کچھ ہے وہ علم نہیں ہے، تخیل ہے
اور گمان ہے۔ میرے تخیل کی پرواز بڑی اونچی ہے
میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں حقیقت تک نہیں
پہنچ سکا ہوں"

وہ شخص اس سلسلے میں بڑے اچھے اشعار بھی رکھتا تھا:

ترسم بروم عالم جان نادیدہ
بیرون روم ازجہان، جہان نادیدہ

در عالم جان چون روم از عالم تن
در عالم تن، عالم جان نادیدہ

یہ بات درست بھی ہے۔ اس شخص نے نجم الدین کبری سے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے ایک کام کریں
میرے پاس جو کچھ علم ہے اسے درست فرما دیں۔

اور مجھے ایک نئی حقیقت عطا فرمائیں۔"

نجم الدین نے فرمایا:

"اچھا میں اس کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے کہ تو ان تمام بتوں کو جو تیرے سینے میں ہیں نکال کر باہر پھینک دے اور ان سب کو بھول جا۔"

اس شخص نے کہا:

"میں حاضر ہوں ــ"

نجم الدین نے پوچھا:

"کیا تو مطمئن ہے ــ؟"

اس شخص نے جواب دیا:

"بے شک میں اس کام کے لیے آمادہ ہوں ــ"

لیکن جب عمل شروع کرنے کا وقت آیا تو وہ شخص کہنے لگا:

"جناب! مجھ میں اس کی قوت برداشت نہیں ہے ــ"

اسی لیے بعض مقامات پر قرآن کہتا ہے:

وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ

یہاں مقصود شرح صدر ہے اور شرح صدر، سعہ صدر سے علاوہ ہے۔ شرح صدر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی روح سربستہ کو کھولتا ہے اور اپنا نور

ہے میں ڈالتا ہے اور یہ شرح صدر اسلام کے لیے ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا شرح صدر ہی ہے کہ ایک امی کی زبان سے بزرگ ترین حکمتوں کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں

"مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا

جَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ

عَلٰی لِسَانِهٖ"

"جس نے خالص کر لیا اپنے آپ کو اللہ کے لیے
چالیس دن تک تو اس کے قلب سے اس کی
زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ"

"یعنی کیا ہم نے تجھے شرح صدر عطا نہیں کیا؟ تیرے سینے کو کھول نہیں دیا کہ اس سے علم، حکمت اور حقیقت کے چشمے جاری ہوں۔"

بعض لوگوں نے کہا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے:

"میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک چیز مانگی اور اس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے پشیمان ہوا۔ کاش! میں نے یہ نہ کہا ہوتا کہ اے خدا تو نے اپنے ان پیغمبروں کو کیا کیا عطا کیا؟۔ اس پر یہ سورہ نازل ہوئی

کہ کیا ہم نے یہ یہ چیزیں تمھیں عطا نہیں کیں ؟
یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمھیں عطا کردہ یہ چیزیں
کہاں اور وہ چیزیں کہاں جو انبیاء سابق کو ہم نے
عطا کیں۔ فرمایا : "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ؟"

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے انشراح یافتہ سینے کو جس سے علم و حکمت کے خزانے اُبل رہے ہیں ایک بڑی نعمت قرار دیا ہے۔

"وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ"

"اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا"

"وضع" کے معنے رکھنے اور نیچے رکھنے کے ہیں۔ اٹھانا اور نیچے رکھ دینا یہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا انعام ہے۔

بھاری بوجھ کیا ہے ؟

سورۂ انشراح کی آیات اور موسیٰ علیہ السلام کے ان دعائیہ کلمات کو اگر ہم پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھیں تو یہ ایک دوسرے کی خوب تصدیق کرتے ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا :

"رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي"

"اے اللہ مجھے شرح صدر عطا فرما۔ یعنی
"میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے"

"وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي"

"اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔"

موسیٰؑ کے ذمے کون سا کام تھا؟ دعوت و تبلیغ کا کام تھا — لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کا کام تھا۔ ظاہر ہے یہ مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام تھا۔

وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً

مِّن لِّسَانِي ۔ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۔

یعنی میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات اور میرے مقصد کو سمجھ لیں اور جان لیں۔ یعنی لوگ اگر میری بات سمجھ سکیں اور جان سکیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور انھیں کس سمت لے جانا چاہتا ہوں۔ تو یہی کافی ہے۔

" وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۔

هَارُونَ أَخِي ۔ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۔

وَأَشْرِكْهُ فِيٓ أَمْرِي ۔

یعنی خدایا میرے لیے ایک وزیر میرے خاندان سے میرے بھائی ہارون کو مقرر فرما۔

وزیر کا مطلب کیا ہے؟

وزیر کا لفظ زیادہ تر بادشاہوں کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے۔ اسے کسی شخص کے جاہ و جلال کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ لغت کی رُو سے وزیر کا مطلب کمک ہے۔ یعنی وہ شخص جو ایک بھاری بوجھ کے اٹھانے میں

کسی دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ اگر آپ اپنے کسی کام کے لیے یا اپنے کاروباری اوارے میں کسی شخص کی خدمات حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ آپ کے کام کے بھاری بوجھ کو ہلکا کردے اور خود بعض ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے تو آپ کے لیے اس کی حیثیت ایک وزیر کی سی ہوگی۔ اس اعتبار سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو اپنا وزیر مقرر فرمایا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کو کبھی بادشاہ قرار نہیں دیا۔ اور ہرگز آپ قرار نہ دیتے۔ اسی طرح موسیٰؑ نے بھی۔ وزیر کا لفظ بادشاہ کے لفظ کا ردلیف نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہر وزیر کے مقابل ایک مَلِک "بادشاہ" لازم ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی علیؑ کو اپنا وزیر قرار دیا تھا۔ اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ علیؑ اس بھاری بوجھ کے اٹھانے میں میرے مددگار ہے ہیں۔ اسی لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علیؑ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"علیؑ میرا وزیر میرا وصی اور میرے دین کا قاضی ہے۔"

وزیر کا مادہ وزر ہے اور وزر کے معنیٰ بھاری بوجھ کے ہیں۔ وزیر وہ شخص ہے جو بھاری بوجھ کے اٹھانے میں مدد کرتا ہے۔ وزیر کا لفظ جس کے معنیٰ بھاری بوجھ کے ہیں۔ گناہ کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

گناہ انسان کے لیے ایک بھاری بوجھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی روح کو بوجھل بناتا ہے۔ یعنی اس سے قوت چھین لیتا ہے اور انسان کو ایسی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ ایک طرح کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے راستہ طے کرتا ہے۔ اس کے برعکس

اطاعت انسان کو ایک قوت عطا کرتی ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔

نیک کام کی خاصیت' قوت عطا کرنا ہے۔ جب کوئی شخص نیک کام انجام دیتا ہے تو وہ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ اسے خوب کھلایا پلایا گیا ہو یا اسے کوئی مقوی کیپسول دیا گیا ہو۔ اور جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہوتی ہے جس کے کمر پر ایک تھیلا رکھ دیا گیا ہو کہ اس کے بوجھ کے ساتھ اس کا راستہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے۔

گناہ کو " وِزر " اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ ایک بھاری بوجھ کی طرح ہے۔ کون سا بھاری بوجھ؟ وہی بھاری بوجھ ـــــ ذمہ داری کا بوجھ ـــــ لوگوں کو دعوت دینا ـــــ ان تک خدا کا پیغام پہنچانا ـــــ لوگوں کی رہنمائی کرنا۔ اگر کوئی شخص فی الواقع لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھانا چاہتا ہے تو کوئی کام اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اب اگر یہاں یہ کہا جائے: "ووضعنا عنك وزرك بعلي" اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا علی کو مددگار بنا کر۔ تو حقیقت کے مطابق ہوگا اور صحیح ہوگا۔ یعنی ہم نے اس بھاری بوجھ کو اس شخص کی مدد سے ہلکا کر دیا جو تیرے لیے ایسا ہی ہے جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے لیے تھے۔ اس کی مدد سے ہم نے اس بوجھ کو آسان کر دیا۔ تیرے بوجھ کو تیرے کاندھوں سے ہم نے اٹھا لیا۔ ہم نے تیرا بوجھ ہلکا کر دیا۔

کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا:

" یاعلی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ "

یہ شیعہ سنی کی متواتر احادیث میں سے ایک ہے جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کے بارے میں یہ بات ارشاد فرمائی ۔ کوئی جنگ ایسی نہیں تھی جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، علیؑ کو اپنے ساتھ نہ لے گئے ہوں لیکن جب آپ جنگ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو علیؑ کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے ۔ کیونکہ یہ ایک نمائشی جنگ تھی ۔ آپ فی الواقع لڑنے کے لیے نہیں گئے تھے ۔ بلکہ جزیرۃ العرب کے شمال میں جہاں شام واقع ہے ۔ مسلمانوں کی قدرت و شوکت کے مظاہرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے ۔ آپ تبوک گئے اور واپس آ گئے اور جانے سے قبل حضرت امیرؑ کو مدینہ میں اپنی جگہ مقرر فرمایا ۔ بعد میں حضرت امیرؑ نے افسردہ دل ہو کر کہا کہ :

> " یا رسول اللہ ! اپنے اس سفر میں آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے ؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

> " اے علیؑ ! کیا تم پسند نہیں کرتے کہ میرے خلیفہ ہو اور تم میرے لیے وہی ہو جو ہارون موسیٰ کے لیے تھے ۔ "

یہی موقع تھا جب کہ آپ نے فرمایا تھا : " انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ " یعنی میرے ساتھ تمہارا تعلق ویسا ہی ہے جیسا کہ ہارونؑ کا موسیٰؑ کے ساتھ تھا ۔ ایک فرق کے ساتھ " الا انہ لانبی بعدی "

یعنی ہارونؑ پیغمبر تھے اور موسیٰؑ کے بعد پیغمبر ہو سکتے تھے لیکن میرے بعد چونکہ پیغمبری نہیں ہے اس لیے تو پیغمبر نہیں ہے۔ البتہ میرے اور تیرے درمیان تمام روابط وہی ہیں جو وزیر ہارونؑ کے موسیٰؑ کے ساتھ تھے۔

اس طرح علیؑ پیغمبرؐ کے وزیر ہیں۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی اور بعد میں بتدریج مدینہ کے زمانے میں لوگ آئے اور خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے چلے گئے۔ یہ وہ موقع تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانوں پر رکھا ہوا بوجھ اٹھا لیا گیا تھا۔ یہ ہلکا ہو گیا تھا۔ آپ کا کام انجام پا چکا تھا۔

"اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ"

یعنی وہ بھاری بوجھ جس کی وجہ سے تیری پیٹھ کی ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں "ظہر" کے معنی ہیں۔ چھت کی ہیٹھ۔ اگر کوئی شخص چھت پر بڑا بھاری بوجھ رکھ دیتا ہے تو چھت کے شہتیروں کی چرچراہٹ سنائی دینے لگتی ہے اور پھر چھت کے بیٹھ جانے کا بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانوں پر جو بوجھ رکھا گیا تھا۔ اس کے سنگین ہونے کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بوجھ اس قدر بھاری تھا کہ تیری پیٹھ کی ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں۔ کس طرح ہم نے اس بھاری بوجھ کو تیری پیٹھ پر سے اتار کر نیچے رکھ دیا اور تو کامیاب ہو گیا؟

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"

ہم نے تیرا بوجھ تیرے شانوں پر سے اتار دیا اور اس کے بدلے میں

تیرے نام کو اور تیرے آوازہ کو بلند کر دیا۔ تیرے نام کو اپنے نام سے قریب کیا اذان کی صورت میں جب اشھد ان لا الہ الا اللہ کی آواز بلند ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اشھد ان محمداً رسول اللہ کی آواز بھی بلند کی جاتی ہے۔

یہاں تک کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد کا مضمون ایک فلسفہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تک تو معاملہ صرف شخصی تھا اور پیغمبر سے کہا گیا تھا کہ تو ایسا اور ایسا ہے اور ہم نے تیرے ساتھ یہ کچھ کیا۔ اس کے بعد جو بات بیان فرمائی گئی وہ ایک اصول اور فلسفے کے طور پر بیان کی گئی۔ اور پھر اس سے ایک نتیجہ حاصل کیا گیا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔

قاعدہ کلی یہ ہے کہ مشقت و سختی اپنے ساتھ آسانی بھی رکھتی ہے آسانیاں سختیوں میں ہیں۔ ان دو آیتوں میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اشارہ اس جانب کیا گیا ہے کہ ابتدا میں تیرا کام کس قدر مشکل تھا۔ تیرا بوجھ اس قدر بھاری تھا کہ تیری پیٹھ کی ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں۔ دشمن یہ کوشش کر رہا تھا کہ تیرے نام کو پوری طرح مٹا دے لیکن اس کے برعکس ہوا۔ اللہ کا قانون یہی ہے۔

"فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" یعنی سختی کے ساتھ آسانی ہے۔ اصل مراد یہ ہے کہ سختی کے پیچھے آسانی آتی ہے۔ تاریک رات کے بعد سپیدہ سحر نمودار ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ کیوں کہا:

"سختی کے ساتھ آسانی ہے۔"

قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ صرف ایک ہی چیز کا تسلسل و تواتر نہیں ہے کہ بس ہمیشہ سختی رہے گی۔ ایک وقت آتا ہے جب آسانی میسر آتی ہے۔ یہ آسانی دراصل سختی کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ سختیاں دراصل آسانیوں کی ماں ہوتی ہیں۔ یعنی اگر آپ آسانی، خوشحالی اور سعادت کے طلب گار ہیں تو جب تک آپ سختیوں اور مصائب و شدائد کی راہ سے نہیں گزریں گے۔ آپ راحت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہ ایک عجیب تعبیر اور ایک عجیب قاعدہ کلی ہے۔

باوجود اس کے کہ پہلا معاملہ صرف پیغمبرؐ کا شخصی معاملہ ہے — یعنی کہ ہم نے کون سی نعمتیں ہیں جو تجھے نہ دیں؟

کیا ہم نے تجھے شرح صدر عطا نہیں کیا؟

کیا ہم نے بھاری بوجھ تیری پیٹھ سے نہیں اتار دیا؟

کیا ہم نے تیرے نام کا آوازہ بلند نہیں کیا؟

لیکن یہ سب کچھ کس قانون کے تحت ہوا؟ ہمارے کام ایک قانون اور سنت کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ اور وہ قانون و سنت کیا ہے؟

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔

یہ ہمارا قانون اور ہماری سنت ہے۔ سختی کے ساتھ آسانی ہے۔ قانون یہی ہے۔

جیسا کہ ہم سورہ سجدہ میں پڑھتے ہیں کہ:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ
بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
يُوْقِنُوْنَ ○

یعنی ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے کہ وہ لوگوں
کو ہمارے امر کی طرف ہدایت کریں۔

ایسا کیوں ہوا ؟
اس لیے کہ ان لوگوں نے سختیوں میں صبر اختیار کیا تھا۔ اور اس
لیے کہ وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ ایمان با عمل سختیوں کے ساتھ
ملا ہوا ہوتا ہے۔ یہی بات دوسری آیات میں بھی بیان کی گئی ہے۔ مثلاً
سورہ آل عمران کی یہ آیت :

"وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ
كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا
اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ
وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْۤ

اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا

عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰـهُـمُ

اللّٰهُ ثَوَابَ الـدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ

الْاٰخِـرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

تاریخ کے طویل دور میں کتنے خدا پرست اور حق پرست انسانوں نے پیغمبروں کے ساتھ مل کر اللہ کی راہ میں جنگ کی۔ "فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ" یعنی اللہ کی راہ میں انھوں نے بہت سے شدائد کا سامنا کیا لیکن وہ سُست نہیں ہوئے۔ ان میں "وھن" پیدا نہ ہوا۔

وَمَا ضَعُفُوْا :

ضعیف نہیں ہوئے یعنی ان کا جوش وجذبہ کمزور نہیں ہوا

وَمَا اسْتَكَانُوْا :

انھوں نے پریشانی، کمزوری اور عاجزی وبے بسی کا اظہار نہیں کیا۔ دوسرے الفاظ میں ان کی روح کو کوئی طاقت شکست نہ دے سکی۔ استکانت اور تزلزل کو انھوں نے اپنے راستے میں آنے نہ دیا۔ وہ صرف خدا کی پناہ لیتے تھے۔ اور صرف خدا سے مدد مانگتے تھے۔ ان کی بات بجز اس کے اور کچھ نہ ہوتی۔ وہ صرف یہی کہتے:

"اے پروردگار! اپنی راہ میں ہمیں صبر واستقامت
عطا فرما، اے رب ہمیں اپنی نصرت سے نواز۔
رب العالمین کافروں پر ہمیں فتح دے۔"

چونکہ یہ لوگ اس شان کے تھے اور انھوں نے ایسی ایسی سختیاں انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کی تھیں:

"فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۔"

"اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کا اچھا ثواب بھی انھیں عطا کیا۔"

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام کے اس خطبے میں میں نے بار بار پڑھا ہے کہ وہ اپنے اصحاب کو متنبہ کرتے ہوئے انھیں آگاہ کرتے ہیں کہ:

"لوگ جب سست پڑ جاتے ہیں تو ان میں ایک خاص ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

یہ ذہنیت لوگوں میں ظاہر ہے اور دیکھی جا سکتی ہے۔ اس طرز فکر کے ساتھ لوگ سوچتے ہیں:

ہم اصحابِ علیؑ ہیں ـــــ ہم یارانِ علیؑ ہیں ـــــ کیا علیؑ پیغمبرؐ کے داماد نہیں ہیں ـــــ؟ کیا وہ پیغمبرؐ کے وصی نہیں ہیں ـــــ؟ کیا وہ پیغمبرؐ کے خلیفۂ حق نہیں ہیں ـــــ؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہمیں معاویہ کے لشکر پر فتح حاصل ہونی چاہیے ـــــ جب ہم علیؑ کے پیرو ہیں تو معاویہ کے لشکر پر ہمیں غالب آنا چاہیے۔

اس طرزِ فکر کے جواب میں علیؑ کہتے ہیں:

"ایسا نہیں ہے۔ یہ سنتِ الٰہی نہیں ہے کہ جب ہم نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے تو لازماً ہمیں فتح حاصل ہونی چاہیے۔"

آپ نے فرمایا:
"ہم نے خود پیغمبرؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ایمان لائے تھے۔ اس کے باوجود خدا نے اس آسانی کے ساتھ ہمیں فتح عطا نہیں کی تھی"۔

"ولقد کنا مع رسول اللہ نقتل

آبائنا و ابنائنا و اعمامنا"

یعنی ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ تھے اور اللہ کی راہ میں ہم اپنے باپوں کو قتل کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہمارے مقابل آ گئے تھے۔ ہم اپنے بیٹوں کو قتل کرتے تھے۔ ہم اپنے چچاؤں کو قتل کرتے تھے۔ ہم اپنے بھائیوں کو قتل کرتے تھے۔ ہم نے کس قدر سختیاں برداشت کی تھیں۔ میدان جنگ میں جب ہم دشمن کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے تھے تو ہماری مثال ان دو نر اونٹوں کی سی ہوتی تھی جو ایک دوسرے کے ساتھ بھڑ گئے ہوں۔ ہم کبھی ان سے زخم کھاتے اور کبھی وہ ہم سے زخم کھاتے تھے۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ:

"چونکہ ہم پیغمبر کے ہم رکاب تھے اس لیے جیسے ہی ہم نے اپنی شمشیر کو اشارہ کیا، اس نے دشمن کی کھوپڑی کو اڑا کر رکھ دیا"۔

بعد میں جب اس طرح ہم امتحان کے مرحلے سے اپنی سچی نیت کی بنا پر کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔

علیؑ کہتے ہیں:

"ہماری نیت کی صداقت ہمارے عمل میں ظاہر

ہوئی نہ کہ شہادت کے دونوں کلمے پڑھنے میں۔

جب عمل میں ہماری نیت کی صداقت ظاہر

ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنی نصرت نازل

فرمائی۔ یعنی اسی آیت کے مطابق"

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا

پیغمبرؐ! تو نے بڑی سختی برداشت کی، یہ ثمرات ہیں ان سختیوں کے۔

اس کے بعد یہ حکم بھی بڑا عجیب ہے:

"فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ"

یعنی۔ اب کہ تم فارغ ہو گئے اور بوجھ تمہارے شانوں سے اٹھا لیا گیا

تو کیا تم جا کر اطمینان کی نیند سو جاؤ گے۔

اگر راحت کی نیند سو گئے تو پھر وہی بدبختی ہے۔ ساری بدبختی آرام

راحت اور خوشحالی کی عادت کے سبب ہے۔ خوشحالی سے زیادہ کوئی چیز

آدمی کی دشمن نہیں ہے۔

اس لیے "فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ"

ان کاموں سے جب تو فارغ ہو گیا۔ پھر خود کو محنت و مشقت میں

ڈال ——— اپنے لیے شدائد پیدا کر ——— یعنی ——— آرام و راحت کی

عادت نہ پیدا کر۔

اگر مرد خدا کو اجتماعی مسائل میں شدائد درپیش نہ ہوں تو عبادت کی

شدائد و سختیاں تو اس کے لیے موجود ہیں۔ پیغمبر کے لیے جب اجتماعی شدائد

نہ ہوں تو کیا وہ رات سوتے ہوئے گزار دے اور اسی طرح صبح کر دے۔؟!

نہیں، اس کے لیے آرام نہیں ہے۔

"فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ"

وہ پھر خود کو مشقت میں ڈالے اور راحت طلبی کو اختیار نہ کرے اس لیے کہ راحت طلبی انسان کی دشمن ہے۔

"فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ"

وَالسَّلَام

امیر المومنین

حضرت علی ابن ابی طالبؑ

نے فرمایا :

○ —— یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا۔

○ —— قرآن میں ان کے حالات ہیں جو تم سے پہلے گزرے تمھارے بارے میں فیصلہ ہے اور تمھارے حشر و نشر کے بارے میں اطلاع ہے۔

○ —— جو قرآن کے قریب ہوا اس کی ہدایت میں اضافہ ہوا اور گمراہی اس سے دور ہوئی۔

قدر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ○ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ○ لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَہۡرٍ ○ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ○ سَلٰمٌ ۟ۛ ہِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ○

میری گفتگو کا موضوع قرآن کی مبارک سورہ قدر[1] ہے۔ یہ سورہ

---

[1] قضا و قدر کے دو اقسام ہیں۔ ایک قضا و قدر وہ ہے جس میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور دوسری وہ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہم رمضان کی دعاؤں میں پڑھتے ہیں: اے

باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

قرآن کی ان سورتوں میں سے ہے جو اپنی مخصوص ساخت اور آہنگ رکھتی ہیں ایک سوال انگیز مسئلہ کا اس سورہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اب ہم ان آیات اور ایسی ہی دوسری آیات میں تدبر و تفکر کے ذریعہ اس چھوٹی سی سورہ سے استفادہ کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے ہم اس سورہ کا تحت اللفظ ترجمہ کریں گے اور اس کے بعد اس کی تفسیر کریں گے۔

(حاشیۂ گزشتہ سے پیوستہ)

اللہ ہم تجھ سے مانگتے ہیں ہمارے لیے اس طرح کی قضا و قدر کو مقدر فرما دے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

پس معلوم ہوا کہ قضا و قدر کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ تبدیل ہونے والی۔

۲۔ تبدیل نہ ہونے والی۔

دعا۔ انسان کے لیے بلند ترین مقام ہے۔ کیونکہ انسان دعا کے ذریعے تقدیر کے فیصلے بدلنا چاہتا ہے۔ یعنی وہ زمین سے آسمانی فیصلوں پر اثرانداز ہونا چاہتا ہے وہ اس عالم طبیعت میں رہ کر ماورائے طبیعت ہونے والے فیصلوں کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کون سی تقدیر قابل تبدل ہے اور کونسی نہیں۔ ہم اس امید میں دعا کرتے ہیں کہ ممکن ہے تقدیر تغیر پذیر ہو۔ اور وہ ہماری دعا سے بدل جائے یہ بھی امکان ہے کہ تقدیر تغیر پذیر نہ ہو۔ بہر حال ہم دعا کرتے ہیں۔ دعا ہر حال میں عبادت ہے اپنے دو اثرات رکھتی ہے۔

۱۔ وہ بذات خود عبادت ہے اور انسان کو خدا سے قریب کرنے والی ہے۔

۲۔ دعا اگر قبول نہ ہو تب بھی وہ قبولیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اصل دعا اپنا نتیجہ دیتی ہے۔ جو چیز مانگی گئی ہے اس کا ملنا نہ ملنا ایک دوسری بات ہے۔

قرآن کہتا ہے:

"ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے
اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟"

سورت میں یہ جو بات کہی گئی ہے کہ تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ اس رات کی غیر معمولی عظمت ظاہر کرنے کے لیے کہی گئی ہے۔ یعنی انسان شب قدر کے بارے میں کیا جانتا ہے یہ تو بڑی بزرگ اور عظیم چیز ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ۔"

"شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر و برتر ہے"

اس کے بعد کی آیت میں اس کے بہتر و برتر ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے
ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔"

"سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔"

"وہ رات سراسر سلامتی ہے۔ طلوع فجر تک یعنی
اس ساری رات میں سلام ہے اور درود ہے۔"

(سورت کا یہ تحت اللفظی ترجمہ تھا۔)

سب سے پہلے اس سورت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا لیکن تعین کے ساتھ یہ نہیں بتایا گیا کہ سال بھر کی راتوں میں سے کون سی رات شب قدر ہے، صرف یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا۔ لیکن سورہ بقرہ کی ایک آیت کسی حد تک شب قدر

کا تعین کرتی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ؀

اس آیت میں رمضان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا"

اس طرح ہمیں معلوم ہوا کہ شب قدر رمضان میں ہے اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس آیت نے نزول قرآن کے زمانے کا تعین کر دیا اور اس مبارک رات کے نام اور عنوان کا بھی تعین کر دیا۔ ان دونوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شب قدر رمضان سے باہر نہیں ہے۔ اسی ماہ کے اندر واقع ہے۔

ایک دوسری آیت سورہ 'دخان' سے تعلق رکھتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس رات کے بارے میں ایک وضاحت فرمائی ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس توضیح سے ایک دوسرا مطلب حاصل ہوتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

" حٰمٓ ۝ وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ ۝

"یعنی ہم نے قرآن کو ایک مبارک اور پُر برکت رات میں نازل کیا کیونکہ ہم ہمیشہ متنبہ کرنے والے اور ڈرانے والے تھے اور ہیں....."

"فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝"

سورۂ بقرہ کی آیت کی رُو سے وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا وہ ماہِ رمضان کا ایک حصہ ہے اور جو کچھ اس سورۂ دخان میں آیا ہے اس کی رُو سے اس مبارک رات میں معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ یعنی ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ خدا کی طرف سے صادر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک شب تقدیر ہے۔ یہ ایک ایسی رات ہے جس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔

سورۂ قدر میں فرمایا:

"اس رات میں فرشتے اور روح اپنے رب کے اذن
سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔"

مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کی رو سے یہ ایک واقعہ اور مسئلہ ہے۔

اس سے متعلق چند مسائل پر یہاں گفتگو اور بحث ہونی چاہیے:

یہ سوال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے۔ 'قرآن رمضان میں اور شب قدر میں نازل ہوا، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت رمضان میں ہوئی۔ پھر ہم کیوں آپ کی بعثت کی تاریخ ۲۷ر رجب قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کے الفاظ کا تعلق ہے۔ قرآن رمضان میں نازل ہوا۔

ایک اور بات بھی ہے جو اس سوال کا جواب تو نہیں ہے تاہم قرآن سے اس کا استفادہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا نزول پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دو طرح سے ہے:

۱۔ ایک نزول دفعی دوسرے الفاظ میں نزول اجمالی ۔ اور

۲۔ ایک نزول تدریجی جس کو نزول تفصیلی بھی کہا جا سکتا ہے۔

نزول اجمالی کا مطلب ہم اسے غیر زمانی کہہ کر بھی بیان کر سکتے ہیں اور نزولِ تفصیلی و تدریجی کو نزول زمانی بھی کہا جا سکتا ہے۔ لغت عرب میں نزول کا تعلق دو باب سے ہے ایک کو باب افعال کہتے ہیں جو انزال کے ساتھ آتا ہے

انا انزلنٰه فی لیلة القدر

دوسرے کا تعلق بابِ تفعیل سے ہے۔

تنزیل و انزلنٰه ۔ علمائے عرب کہتے ہیں کہ یہ دونوں صیغے باہم فرق رکھتے ہیں۔ انزلنٰه اس جگہ کہا جاتا ہے جہاں کوئی چیز دفعتاً وارد ہوتی ہے اور تنزیل ایسے موقع کے لیے کہا جاتا ہے جہاں نزول تدریجاً ہو۔

پس قرآن کا نزول انزالی بھی ہے اور تنزیلی بھی۔ جیسا کہ فرمایا:

"انا انزلنٰه فی لیلة القدر"[1] یا

"شهر رمضان الذی انزل فیه القراٰن"[2]

"حٰمٓ ۔ والکتٰب المبین انا انزلنٰه فی لیلة مبارکة"[3]

ان آیات میں نزول کو باب افعال کے تحت لایا گیا ہے۔ یہ آیات

---

[1] ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا

[2] رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔

[3] حم۔ روشن کتاب کی قسم ہم نے اسے مبارک رات میں نازل کیا۔

ایک نزول دفعی یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک نزول اجمالی اور غیر زمانی کو ظاہر کرتی ہیں۔

تدریجی اور تفصیلی نزول سے قبل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کا ایک اجمالی نزول ہوا۔ یعنی آپ پر قرآن ایک روح کی صورت میں نازل ہوا۔ آیات و کلمات اور الفاظ کی صورت میں نہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق نزول تفصیلی سے ہے۔ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس روح کے حامل ہو گئے جو روح قرآن تھی تو آپ پر دوسرے درجے کا نزول شروع ہوا۔

اجمالی نزول کے وقت جو چیز ایک روح کے مانند پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی بعد میں اس نے الفاظ و کلمات کی صورت اختیار کر لی۔

اس بارے میں ہماری روایتیں زیادہ رہنمائی کرتی ہیں۔ ائمہ اطہارؑ سے یہ بات ہم تک کثرت سے پہنچی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن دو بار یعنی دو صورتوں میں نازل ہوا۔ اس کے نزول کی ایک صورت اجمالی اور دفعی ہے۔ اور دوسری صورت تدریجی، زمانی اور تفصیلی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دفعی اور اجمالی صورت میں ایک روح کی صورت سب سے پہلے جو قرآن نازل ہوا تھا وہ وہی ہے جو رمضان کے مہینے میں نازل ہوا تھا۔ اس وقت ابھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث نہیں کیا گیا تھا اس نزول سے آپ کی بعثت نہیں ہوئی تھی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت بعثت حاصل ہوئی جب جبرئیلؑ اس قرآن، اس روح اور اس حقیقت کو الفاظ اور کلمات کی صورت میں لے کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے۔ یہی وقت آپ کی بعثت کا ہے جس کا تعلق ماہِ رجب سے ہے اور جس نے اپنے ۲۳ سال پورے کیے۔

نزولِ قرآن کے بارے میں ہمیں دو لفظ ملتے ہیں ایک قرآن اور دوسرے فرقان۔ سورۃ فرقان میں ارشاد ہوا:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝

"نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کردینے والا ہو۔"

یعنی منزہ ہے وہ ذات کہ جس نے فرقان کو نازل کیا۔ فرقان کا مادہ فرق ہے۔ فرق یعنی الگ کرنا، جدا جدا کرنا۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوا

"وہ قرآن جسے ہم نے جدا جدا کیا۔ اسے فرقان بنایا۔"

الگ کیا۔ یعنی اس کے حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا تاکہ اے پیغمبر تم اسے تھوڑا تھوڑا کرکے لوگوں کے سامنے پڑھو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کو اس لیے قرآن کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مجموعہ کی صورت رکھتا ہے اور فرقان اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ الگ الگ ہونے کی تفصیلی حالت رکھتا ہے اور اسی صورت میں آیات و کلمات نازل ہوئے ہیں۔ ہماری ان باتوں کا تعلق اس بات سے تھا کہ قرآن کا نزول ماہِ رمضان میں ہوا یا ماہِ رجب میں۔

اب ہم اس آیت پر غور کرتے ہیں: وما ادرٰک ما لیلۃ القدر

"تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟"

پہلی بات تو یہ ہے کہ لیلۃ القدر کو لیلۃ القدر کیوں کہا جاتا ہے ؟
کیا اس لیے کہ وہ شب ، شبِ تقدیر ہے ؟
یعنی وہ شب جس میں قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یعنی سال بھر میں ایک رات ایسی ہے جس میں لوگوں کی اس سال کی مقدرات کا تعین کیا جاتا ہے۔
یا پھر شبِ قدر اس لیے کہا گیا ہے کہ قدر کے معنی قیمت اور وقعت کے ہوتے ہیں۔ یعنی بڑی قیمت و وقعت والی رات۔
اگر ہم دوسرے معنیٰ کو اختیار کریں تو اس رات کی قدر و قیمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دوسرے معنی ہی قابل ترجیح ہیں اس لیے کہ بعد میں ارشاد ہوا:
"شبِ قدر ہزار ماہ سے بہتر ہے۔"
یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمان و مکان یا زمان و مکان کے اجزا کسی واقعہ کے ساتھ تعلق سے قطع نظر فی ذاتہٖ قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زمانے کے اجزا، اس بنا پر کہ وہ زمانے کا حصہ ہیں ان کے ایک جز اور دوسرے جز کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان سب کا درجہ ایک ہی وجود کا سا ہے۔ ان میں اس طرح کا کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک جز دوسرے جز سے بہتر ہو۔ اجزائے زمانہ میں سے ایک جز تو بافضیلت ہو اور دوسرا بے فضیلت۔
اب آپ اجزائے مکان کو لیں۔ زمین کے بعض قطعات کچھ دوسرے قطعات سے کئی اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ اجزائے مکان اجزائے زمان کی طرح بسیط نہیں ہوتے۔ یہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں البتہ اجزائے مکان کے درمیان فرق مادی ہوتا ہے معنوی نہیں۔
مثلاً ایک سرزمین بنجر ہے۔ چونکہ بنجر ہے اس سے آمدنی نہیں ہوتی۔

ایک دوسری سرزمین بنجر نہیں ہے اس سے زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے! انسان کے لیے مادی فائدے کے لحاظ سے ایک سرزمین برکت سے بھری ہوئی ہے اس کے برعکس دوسری سنگلاخ و بنجر زمین بے خیر اور بے برکت ہے۔ ایک کسان کے لیے اس زرخیز زمین کا ایک ایکڑ اس بنجر زمین کے سو ایکڑ کے برابر ہے۔ اگر ریگستان کا قطعہ زمین کسی کسان کو دیں تو اسے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کے برعکس اگر اسے زرخیز زمین کا ایک ایکڑ دے دیا جائے تو اس کی گزر اوقات کے لیے کافی ہوگا۔ اس اعتبار سے زمینیں بعض مقامات پر بابرکت ہیں اور بعض مقامات پر بے برکت۔

یہ ایک مادی معاملہ ہے جس کا تعلق مادی زندگی سے ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

کیا معنوی اعتبار سے زمینیں فی ذاتہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں؟ قطع نظر اس سے کہ کوئی حادثہ یا کوئی واقعہ ان زمینوں پر واقع ہوا ہو۔

جب اس دنیا پر انسان کا وجود نہیں تھا تو کیا اس زمین کے مختلف حصے باہم فرق رکھتے تھے؟

مثلاً مکہ یا کعبہ کی سرزمین کسی آدمی کے دنیا میں پیدا ہونے سے قبل یا ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کے پیدا ہونے سے قبل باقی سرزمینوں پر فی ذاتہ کوئی امتیاز رکھتی تھی یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نہ اجزائے زمان اور نہ اجزائے مکان، دونوں میں سے کوئی بھی معنوی نقطہ نظر سے بذات خود کوئی فرق باہم نہیں رکھتے۔ نہ کوئی زمین بابرکت ہے اور نہ کوئی زمین خبیث (معنوی اعتبار سے) تمام سرزمینیں برابر اور مساوی ہیں لیکن کسی عارضی سبب سے کوئی سرزمین ایک مبارک سرزمین

میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

مثلاً کوئی اُفتادہ زمین بعد میں ایک مسجد کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس وقت اس کی حیثیت ایک عبادت گاہ کی ہو جاتی ہے یعنی وہ جگہ مبارک ہو جاتی ہے۔

ایسا کیوں ہے ؟

اس لیے کہ اس افتادہ جگہ کو ہم نے مسجد قرار دے دیا۔ سرزمینوں کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ازل سے جانتا ہے کہ فلاں سرزمین کس بنا پر مقام برکت بن جائے گی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ جگہ مبارک رہی ہے۔ یہ ایک مسئلہ تھا کہ کوئی جگہ فی ذاتہٖ فرق و امتیاز رکھتی ہو۔

اب دوسرا مسئلہ کعبہ کا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے بلکہ آدمؑ کے زمانے سے زمین کا یہ سب سے پہلا نقطہ تھا جو مسجد کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ تاکہ خدائے واحد کی وہاں پرستش کی جائے۔ وہ عبادت گاہ بھی ہے اور خانۂ خدا بھی۔ کعبہ کو تمام مسجدوں کے احترام پر غیر معمولی فوقیت رکھنے والا ایک احترام حاصل ہے اس لیے کہ خدا کے اولیاء میں سے ایک ولی نے وہاں نماز ادا کی ہے اس لیے اسے دوسری مساجد پر ایک امتیاز حاصل ہے۔

مثلاً عراق کی تمام مساجد مقدس ہیں لیکن ایک مسجد کی تقدیس میں اس لیے اضافہ ہو گیا کہ علیؑ نے اس جگہ نماز ادا کی تھی۔ یہی حال اس مسجد کا ہے جہاں امام زین العابدینؑ نے دو رکعت نماز ادا کی تھی۔ وہاں دو رکعت نماز ادا کرنا ہمارے لیے مستحب ہے اور یہ چیز عبادت کو شرف اور وقعت عطا کرتی ہے۔

اس طرح کعبہ کو ایک شرف حاصل ہو گیا۔ کسی دوسری مسجد یا عبادت گاہ کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔

زمانے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ زمانوں کو انسان کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ کسی زمانے کو عبادت کے لیے معین کیا گیا اور لوگ زمانے کے اس حصے میں عبادت کرنے لگے اور ان کی باہم مل کر عبادت کرنے کی آواز آسمان پر پہنچنے لگی یہ ایک دوسری فضیلت ہے جو زمانے کے اس حصے کو حاصل ہوئی۔

اب ہم "لیلۃ القدر" پر غور کرتے ہیں۔ قرآن کی رو سے یہ شب قدر ہزار راتوں سے بہتر ہے اور اسی رات قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوا۔

اہل تسنن میں سے اکثر کا خیال یہ ہے کہ شب قدر کی تعداد ایک سے زیادہ ہے لیکن یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے کے ساتھ مخصوص تھی اور اس وقت تک تھی جب تک آپ بقید حیات تھے، یہ رات ہر سال آتی تھی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی وہ بھی باقی نہیں رہی۔ یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔

شب قدر کا سلسلہ قائم و جاری ہے،

کیا ہر پیغمبر کی شب قدر رہی ہے یا نہیں؟

خود پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر موجود رہی ہے اور جو بھی پیغمبر اس دنیا میں آیا اس کی ایک شب قدر تھی۔

کیا اس روئے زمین پر کسی آدمی یا پیغمبر کے پیدا ہونے سے پہلے بھی شب قدر موجود تھی یا نہیں؟

یہ بات فیصلہ طلب ہے؟

شب قدر یعنی انسانِ کامل کی شب، ولیٔ کامل کی شب۔ خود قرآن سے ہمیں کیا معلوم ہوتا ہے؟

قرآن نے "اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ" کے بعد

ایک بار پھر 'لیلۃ القدر' کہا اور اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوا:

"خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَہْرٍ"

قرآن نے لَیْلَۃُ الْقَدْرِ کَانَ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَہْرٍ

یعنی شب قدر ہزار ماہ سے بہتر تھی، نہیں کہا۔

مزید یہ کہ ارشاد خداوندی ہے۔ ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا۔ یہ بات ماضی کے صیغے میں کہی گئی۔ اس کے بعد کی آیت کا صیغہ فعل مضارع دوام یا استمرار کا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْہَا بِاِذْنِ رَبِّہِمْ مِّنْ کُلِّ اَمْرٍ"

یعنی اس رات فرشتے اور روح اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ یہ ایک ایسی رات ہے جس میں زمین اور آسمان کے درمیان تعلق اور رابطہ برقرار رہتا ہے۔ یہ زمین و آسمان کے درمیان ارتباط برقرار رکھنے کی رات ہے۔ ایک ملک نہ دو ملک بلکہ اس رات میں ملائکہ اور روح نیچے آتے ہیں۔

یہ نہیں کہا گیا کہ 'نیچے آئے'! نیچے آتے ہیں کہا گیا۔

جو لوگ کہ شب قدر کی ہمیشگی کے قائل نہیں ہیں وہ تعداد میں کم ہیں۔

ائمہؑ فرماتے ہیں:

> "ان لوگوں سے پوچھو کہ شب قدر میں ملائکہ اور روح نیچے اترتے ہیں تو وہ کس جگہ، کہاں اترتے ہیں؟ کیا ملائکہ اور روح زمین پر اترتے ہیں؟ یا یہ دل پر اترتے ہیں؟ دراصل ملائکہ انسان پر اترتے ہیں اس کے قلب پر اترتے ہیں۔ انسان کا قلب ایسا

قلب ہونا چاہیے کہ اس پر ملائکہ اتریں۔"

ملائکہ کا صرف نیچے اترنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ صد فی صد مطلب یہ ہے کہ شب قدر انسان کامل کی شب ہے۔ یہ ماہِ رمضان ہی میں کیوں ہو؟ کم از کم اسلام میں ماہ رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں یہ شب نہیں ہوتی۔

پیغمبر اور اسی طرح اولیاء اللہ جیسے ائمہ اطہار جو بہت سے پیغمبروں سے کبھی برتر اور بالا مقام کے حامل رہے ہیں۔ یہ خدا کے مقرب بندے اسی عالم قرب میں اپنے کچھ ایسے مسائل رکھتے ہیں کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے ان مسائل کا ادراک مشکل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پیغمبری کے منصب پر فائز ہونے کے بعد یہ چاہا کہ ان پر ارواح نازل ہوں۔ انھیں چالیس روز پروردگار کی میقات پر جانا پڑا۔ پہلی تیس راتوں میں وہ اپنے سلوک کے مرحلے کو پورا نہ کر سکے

"..... وَاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ....."

موسیٰؑ کو تیس راتوں کے وعدے پر بلایا گیا تھا اور موسیٰؑ نے ان تیس راتوں میں زبردست مجاہدات کیے تاکہ مطلوبہ باطنی شائستگی پیدا کر سکیں لیکن وہ اس مدت میں اسے حاصل نہ کر سکے۔ اس لیے مزید دس راتوں کا اضافہ کیا گیا۔

یہ تیس راتیں، پہلی ذی القعدہ سے آخر تک کی تھیں۔ ان پر مزید جو دس راتیں اضافہ کی گئیں وہ پہلی ذی الحجہ سے دس ذی الحجہ تک کی تھیں۔ دسویں ذی الحجہ کو موسیٰؑ کا سینہ کھل گیا اور پھر جو کچھ اللہ تعالےٰ نے چاہا موسیٰؑ کے قلب پر نازل کیا۔

اپنی پیغمبری کا ایک دور گزارنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو یہ ایک اور مجاہدہ کرنا پڑا۔ ہر انسان اور ہر ولی کامل کو سال میں ایک بار مجاہدے کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے۔

ہر مومن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دن رات میں پانچ بار نماز ادا کرے اور سال کا ایک مہینہ عبادت میں گزارے۔ پاک ہونے کے لیے ___ اور ___ سلوک الی اللہ کے لیے ___ اور ___ خود کو بلند کرنے کے لیے۔ رمضان کا مہینہ اسی مقصد کے لیے ہے۔

ماہِ رمضان اس کام کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اسی لیے ماہِ رمضان کو دوسرے تمام مہینوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے دسِ ذی الحجہ کا دن افضل ترین دن رہا ہو لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے رمضان کا مہینہ افضل ترین مہینہ رہا ہے۔ ہر امام پہلی رمضان سے آخر رمضان تک ہم سے سوگنا زیادہ استفادہ کرتا ہے (ہم تو کچھ بھی استفادہ نہیں کرتے) اور وہ پہلی رمضان سے اپنے سلوک کا آغاز کرتا ہے یہاں تک کہ وہ رات آجاتی ہے جسے شب قدر کہتے ہیں۔ شب قدر کے آنے کے ساتھ ہی امام پر دروازے کھل جاتے ہیں:

"تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ"

شب قدر کس رات میں ہے۔ روایت میں اس کا تعین نہیں کیا گیا۔ ایک حکمت کے تحت ایسا کیا گیا ہے۔

کیا شب قدر ۱۹ ویں شب میں رہی ہے۔
یا اکیسویں [۲۱] شب میں ___؟
یا تیئسویں [۲۳] شب میں ___؟
یا مثلاً انیسویں شب کو مسائل کے ایک سلسلے کا تعین ہوتا ہے ___؟
پھر اکیسویں شب کو ان مسائل کی توثیق ہوتی ہے ___؟
اور تیئسویں شب کو ان کی منظوری دی جاتی ہے۔

یہاں ایک دوسرا احتمال بھی ہے۔ یعنی شب قدر کا تعین اس لیے نہیں کیا گیا کہ شب قدر ہر سال اس وقت کے امام سے تعلق رکھتی ہے اور اس سال امام کے حالات سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ ممکن ہے امام انیسویں شب ہی کو اپنے مجاہدہ کا مرحلہ پورا کرے اور انیس ۱۹ کی شب ہی کو ملائکہ نازل ہو جائیں۔ اس کے لیے ۲۱ اور ۲۳ کی شب بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ ۱۹ دیں شب سے پہلے یہ شب نہیں آتی۔ ان راتوں میں سے کسی ایک رات میں یہ کام انجام پاتا ہے۔ اس وقت ایک انسان کامل دنیا کے اور انسانوں کے مقدرات پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

شاید ہی کوئی یقین کر سکتا ہے کہ انسان جیسی چھوٹی سی مخلوق کی روح، تقدیر الٰہی کی لوح بن جائے۔

ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے اس لیے کہ ہم انسان کو نہیں پہچانتے انسان کامل کی روح کی لوح تقدیر الٰہی کی لوح ہے۔ یعنی اس لوح پر یہ نزول ہوتا ہے اور تقدیر کے یہ اندازے اور تخمینے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

اس لیے شب قدر انسانِ کامل کی شب ہے اور شب قدر میں قرآن نازل ہوا اور پیغمبر کو ہر سال ایک شب قدر ملی ہے اور امام کو بھی شب قدر ملتی ہے اور کسی وقت بھی زمین انسانِ کامل سے خالی نہیں ہے۔ اور سال شب قدر سے خالی نہیں ہے اور شب قدر ماہ رمضان سے باہر نہیں ہے۔

ہم نے جان لیا کہ شب قدر رمضان کے مہینے میں ہے۔ یہ ایک ایسی رات ہے جس میں زمین اور آسمان کے درمیان، ملک و ملکوت کے رابطہ قائم ہوتا ہے اور قرآن کی تعبیر کی رو سے آسمان کے دروازے زمین پر کھل جاتے ہیں۔ گویا کہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

امام کا وجود مادی بھی ہوتا ہے اور ملکی بھی۔ وہ ماورائی وجود بھی

رکھتا ہے اس کے ایسے وجود کے ذریعے بلکہ اس کے وجود میں گویا طبیعت و ماورائے طبیعت دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اس بات کو اجمالی طور پر اور رمزیہ طریقے پر ہمارے لیے بیان کیا ہے۔

"ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا، تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟"

یہاں "تم کیا جانو" کے مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اکثر دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی روئے سخن لوگوں کی طرف ہے۔ یعنی انسان کیا جانے کہ شب قدر کیا ہے؟ یہ ایک رات، اس کی کون سی چیز ہزار ماہ سے بہتر ہے؟

اس رات کی عبادت کی قدر و قیمت کیوں ہے؟

اس لیے کہ جس وقت ہم نماز پڑھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں:

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ"

عبادت جب اجتماعی صورت میں کی جاتی ہے تو وہ زیادہ بلندی پر جاتی ہے اور اس صورت میں فی الواقع انسان کی روح زیادہ آمادگی اور زیادہ حضوری قلب کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پاک ہستیاں بھی اس اجتماعی عبادت میں شریک رہتی ہیں۔

مادہ کی حالت کے بارے میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس کی ایسی لہریں اور موجیں ہیں جو دنیا کی اس جانب تک پہنچ جاتی ہیں تو پھر روح کی لہروں کا کیا عالم ہوگا کہ جس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔

اگر شب قدر ایسی شب ہو کہ امام اس شب میں حالتِ عبادت میں ہو، اور ایسے جوش و ہیجان کی کیفیت میں ہو کہ عالم روحانی کی فضا میں زمین و آسمان

کے دروازے ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے ہوں تو ایسی شب کی برکتوں کا کیا عالم ہوگا۔ اگر ہم جیسے افراد عبادت کی طرف راغب ہوں تو جو فیض کہ اس شب میں حاصل ہوگا وہ ہزار راتوں کے برابر ہوگا۔ یعنی جو روحانی فضا اس شب میں پیدا ہوتی ہے وہ عبادت کی فضا ہے، انسان کو بلندی پر لے جانے والی ہے اور دلوں کو زندہ کرنے کے لیے ایک اچھی رات ہے۔ اس شب کی فضیلت ان ہزار مہینوں پر برتری رکھتی ہے جن کی راتیں عام اور سادہ راتیں ہیں۔

آخر میں اس گفتگو کا حاصل آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں —
قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے قرآن شب قدر میں نازل کیا اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیسی رات ہے؟ شب قدر ہزار ماہ سے بہتر ہے یعنی راتوں کی کثیر تعداد بھی اس کے درجے کو نہیں پہنچتی۔

کیوں نہیں پہنچتی۔؟

اس لیے کہ ملائکہ اور روح (قرآن کی رو سے روح، ملائکہ سے بالاتر ایک حقیقت ہے) اپنے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔

قرآن نے 'اجازہ و امر' کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے۔ بعض اوقات "امر" کے معنیٰ فرمائش الٰہی کے لیے گئے ہیں اور کبھی تخلیق و ایجاد کے۔

کیونکہ امر الٰہی و ارادۂ الٰہی عین ایجاد ہے۔ اس صورت میں یہ نزول تخلیق و ایجادِ الٰہی سے ہے۔

اگر امر سے حکم کے معنیٰ لیے جائیں تو اس حکم کا تعلق دنیا کے ہر کام سے ہوگا۔

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۔

"یعنی رات سے لے کر صبح تک سلام اور سلامتی ہے۔"

سلام درود کے معنی میں ہے۔ فرشتے درود بھیجتے ہیں اور درود کے ساتھ آتے ہیں۔

اور سلامتی ان معنوں میں ہے کہ اس رات جو بھی اس کی برکتوں سے فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ آفتوں سے، وسوسوں سے اور شیطانی مکر سے دور رہے گا۔

والسلام

امیر المومنین
حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام
نے فرمایا:

○ —— قرآن کریم کی تعلیم حاصل کریں کیونکہ یہ افضل ترین گفتار ہے۔ اس کے بارے میں غور و فکر (تدبر) کریں۔ کیونکہ وہ دلوں کی بہار اور شادابی کا باعث ہے —— اور اس کے نورِ درخشندہ سے شفا طلب کریں —— کیونکہ وہ قلوب کے لیے شفا ہے۔

○ —— جو قرآن کے قریب ہوا اس کی ہدایت میں اضافہ ہوا اور گمراہی اس سے دور ہوئی۔

زلزال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ
اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ
اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۗ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ
اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۗ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ
خَيْرًا يَّرَهٗ ۗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۧ

سورہ زلزال چھوٹی مکی سورتوں میں سے ایک سورت ہے اور یہ ان سورتوں میں سے ہے جن میں قیامت کا ذکر کیا گیا ہے اور جو غیر معمولی طور پر اثر انگیز اور احساسات کو بیدار کرنے والی ہیں۔ خوش آہنگی خوبصورتی اور دلوں میں اتر جانے والی صلاحیت کے اعتبار سے بھی اس کا اعجاز

نمایاں ہے۔
جب زمین ہلا ڈالی جائے گی۔ اس کا یہ ہلا ڈالنا ایک خاص طرح کا ہوگا۔ اس کا بڑی شدت سے ہلنا اور حرکت میں آنا، ان زلزلوں سے کوئی شباہت نہیں رکھے گا جن سے لوگوں کا دنیا میں واسطہ پڑتا رہا ہے۔
قیامت کے اس زلزلے اور دنیا میں آنے والے زلزلوں کے درمیان دو بڑے فرق ہیں۔
ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دنیا میں جتنے زلزلے ظاہر ہوتے ہیں وہ محدود اور جزئی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وہ زمین کے ایک چھوٹے سے دائرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ دائرہ بیس کیلومیٹر کا ہوگا، سو کیلومیٹر کا ہوگا یا زیادہ سے زیادہ پانچ سو کیلومیٹر کا ہوگا۔
ان زلزلوں کا تعلق ان تبدیلیوں سے ہوتا ہے جو زمین کے نیچے کے طبقات میں رونما ہوتی ہیں۔ لاوا یا گیس کی بڑی مقدار زمین کے نیچے کسی خاص حصے میں جمع ہوجاتی ہے اور جب یہ مادے زمین کی سطح سے نکلنے کے لیے زور لگاتے ہیں اور دباؤ ڈالتے ہیں تو ایک محدود علاقے میں زلزلے کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اس علاقے کے لوگ ہی اس سے متاثر ہوتے ہیں جبکہ اس جگہ سے دُور رہنے والوں کو اس زلزلے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔
اس طرح کا کوئی زلزلہ کسی خاص علاقے کو زیروزبر کر دیتا ہے یا ایک پورے شہر کو زمین میں دھنسا دیتا ہے لیکن سو کیلومیٹر اس طرف رہنے والوں کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ قریب ہی کوئی زلزلہ آیا ہے۔
البتہ قرآن جس زلزلہ کا ذکر کرتا ہے وہ زمین کے کسی خاص علاقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی لپیٹ میں پوری زمین آجائے گی بلکہ سارا جہان، تمام

سورج اور جو کچھ ہماری اس کائنات اور دنیا میں ہے اس زلزلے کی زد میں آچکا ہوگا اس وقت کا ذرا آپ تصور کریں کہ تباہی کا کیا عالم ہوگا؟

قیامت کے زلزلے اور دوسرے زلزلوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ یہ عام زلزلے زمین کے نیچے کسی خاص عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایک عامل کسی دوسرے عامل پر اثر انداز ہوتا ہے یا ایک قوت کسی دوسری قوت کو متاثر کرتی ہے یا ایک چیز کسی دوسری چیز سے اثر قبول کرتی ہے۔

فرض کیجیے کہ ہم یہاں بیٹھے ہیں اچانک ایک بڑا ٹرک اپنی شدید آواز کے ساتھ اس عمارت کے قریب سے گزرتا ہے اور اس کی وجہ سے عمارت میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اس عمارت نے بذات خود حرکت نہیں کی بلکہ ایک بیرونی عامل نے اثر انداز ہو کر اسے حرکت دی۔ یا جیسے ایک ساکت وصامت کھڑے ہوئے شخص کو کوئی دوسرا شخص آکر زور سے دھکا دے دے۔

لیکن قرآن جس بڑے زلزلے کا ذکر کرتا ہے، وہ پورے وجود میں زلزلہ لے آئیگا۔ دنیا کے اپنے وجود اور اس کی ذات میں ایک حرکت پیدا ہو جائے گی تشبیہ کے طور پر میں یہ کہوں گا کہ بچہ جب رحم مادر میں ہوتا ہے تو وہ ابتدائی دنوں میں کوئی حرکت نہیں کرتا لیکن جب تین چار ماہ گزر جاتے ہیں تو اچانک بچہ پہلی بار حرکت کرتا ہے۔ کیا بچے کو باہر سے کوئی چیز حرکت دیتی ہے۔ یا اندر سے وہ خود۔ اپنی ذات سے حرکت کرتا ہے؟

زلزلے کا یہ مسئلہ ایک دوسرے مسئلے سے بھی تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ ہے:

"یہ جمادات جن کو ہم بے حس اور بے شعور خیال
کرتے ہیں کیا یہ فی الواقع اپنے تمام معنوں کے
اعتبار سے احساس وشعور سے محروم ہیں۔ یا یہ کہ

انسان کے مقابلے میں فاقد الشعور ہیں لیکن خود اپنے دائرے
میں ایک طرح کے شعور و ادراک سے بہرہ مند ہیں؟"

یہ وہی بات ہے جس کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کوئی موجود مخلوق ایسی نہیں ہے جو اپنے پروردگار کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تمھیں ان کی تسبیح کا ادراک نہیں ہے۔

قرآن ایک اور بات کہتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کیا آخرت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت اس کی تمام موجودات پر ان کی زندگی کا دوسرا رخ ظاہر ہو جائے گا۔

"اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ"

پردہ اٹھتے ہی آخرت کی دوسری زندگی ظاہر ہو گی تو انھیں یہ احساس ہو گا کہ یہ اسی بڑے زلزلے کا نتیجہ ہے جو دنیا میں آیا تھا۔ ٹھیک رحمِ مادر میں موجود اس بچے کی طرح جو دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

جب انسان زلزلِ قیامت کے نتیجے میں اس دوسری دنیا میں قدم رکھے گا تو وہاں انسان یہ محسوس کرے گا کہ تمام ذراتِ عالم، زندگی، شعور اور ادراک کے حامل ہیں۔

"وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا"
یعنی زمین اپنے قیمتی دفینوں کو باہر نکال کر ڈال دیگی"

ان تمام انسانوں کو جو اس کے سینے میں دفن ہیں یہ انسان زمین کے قیمتی دفینے ہیں تنہا یہ انسان ہی زمین کے قیمتی دفینے نہیں بلکہ سونا، چاندی، معدنیات اور تیل بھی اس میں شامل ہیں بلکہ ان تمام چیزوں کو زمین اگل دے گی جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔

"وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا"

یعنی انسان! (نوعِ بشر) جسے قیامت کے زلزلے سے سابقہ پڑ چکا ہے اسے ابھی پوری طرح احساس نہیں ہوا ہے کہ یہ کیا انقلاب آچکا ہے اور وہ بڑی حیرت سے کہتا ہے۔

"اس زمین کو کیا ہو گیا ؟!"

"یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا"

"یعنی اس دن زمین اپنی سرگزشت بیان کرے گی:

لاکھوں کروڑوں سال کی اپنی طویل زندگی کی سرگزشت۔

"بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا"

"کیونکہ تیرے رب نے اسے ایسا کرنے کے لیے وحی کی ہوگی"

'مولوی' کبھی بڑے عجیب طریقے پر اس بارے میں گفتگو کرتے ہیں جس کی مثال بہت کم ملتی ہے وہ تفسیر آدم کے عنوان کے تحت کہتے ہیں:

عالم افسردہ ست، نام او جماد
جامد افسردہ بود ای اوستاد
باش تا کری بہ حشر آید عیان
تا ببینی جنبش جسم جہان

مولوی نے جنبش جسم جہاں کہہ کر اسی زلزلہ قیامت کی طرف اشارہ کیا ہے بعد میں وہ کہتے ہیں تو اس وقت مردہ کو مردہ خیال نہ کر۔ تو نہیں سمجھتا۔ تجھے اس کا ادراک نہیں، اس وقت تو صرف اس کا مردہ چہرہ تیری جانب ہے بعد میں مولوی کہتے ہیں:

چون عصائے موسیٰ اینجا مار شد
عقل را از ساکنان اخبار شد

اس دن جب اچانک مردہ لکڑی سانپ بن گئی تو عقل نے جان لیا کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ ان بے جان چیزوں کو بالکل بے جان نہیں سمجھنا چاہیئے

پارۂ خاک ترا چون زندہ ساخت
خاک ہارا جملگی باید شناخت

مولوی فرماتے ہیں:

تیرا یہ بدن تو ایک بے جان مٹی تھا جواب تجھے زندہ نظر آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مردہ اور زندہ کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ مردہ جلدی زندہ ہو جاتا ہے۔

اب ہمیں تمام خاکیوں کے بارے میں یہ جان لینا چاہیئے کہ ان میں زندگی کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔

وہ اپنے اس رخ کی بنا پر جو ہماری طرف ہے مُردہ ہیں لیکن اپنے اس چہرہ کی رُو سے جو اللہ تعالیٰ کی جانب ہے زندہ ہیں۔ وہ خدا کے پاس زندہ اور مخلوق کے پاس مردہ ہیں۔

مردہ زین سو ید وزان سو زندہ اند
خاموش اینجا و آنطرف گویندہ اند

چونکہ آنہا را فرستد سوئی ما
آن عصا گردد سوئی ما اژدہا

جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنا فرستادہ بنا کر بھیجتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ تمام بے جان زندہ ہیں۔ خدا جسے مامور اور مقرر فرماتا ہے وہ بے جان

چیزوں کا زندہ رُخ ہماری طرف کر دیتا ہے۔

باد حمالِ سلیمانی شود
بحر با موسیٰ سخندانی شود
کوہ ہا ہم لحن داؤدی کند
گوہر آہن بکف مومی کند
ماہ با احمد اشارت بین شود
نار ابراہیم را نسرین شود
سنگ با احمد سلامی می کند
کوہ، یحییٰ را پیامی می کند

ارشاد ہوتا ہے: "یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا"
یعنی زمین خبریں سناتی ہے اور اپنی سرگزشت بیان کرتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہ مضمون قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی بیان ہوا ہے۔ یہ پوری زمین کے بارے میں ہے۔

سورہ مبارکہ یٰسین میں ہم نے پڑھا ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔

"یعنی آج ہم ان کے منہ بند کیے دیتے ہیں اور ان کی زبانوں کو بولنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے"

کہ یہ کیا کرتے رہے تھے!"

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ۔

یعنی اس روز لوگ نکلیں گے[1] گروہ در گروہ متفرق حالت میں۔"

---

[1] لفظ "صدور" عربی زبان میں ایک خاص معنی رکھتا ہے اور یہ ان الفاظ میں سے ہے کہ ہم فارسی زبان میں ابھی تک ان کا بدل نہیں معلوم کر سکا۔ مثلاً شناخت ناموں کے سلسلے میں لکھا جاتا ہے۔ شناخت نامہ تہران سے صادر ہوا ہے یا یہ دستورالعمل فلاں مقام سے صادر ہوا۔ اب ہم صادر کی جگہ کون سا لفظ استعمال کریں جو یہی معنی دے سکے کیونکہ صدور اور خروج میں فرق ہے۔ اگر ہم صادر شدہ کی جگہ خارج شدہ کے الفاظ استعمال کریں اور یہ لکھیں کہ شناخت نامہ تہران سے خارج ہوا ہے تو اس سے معنی میں بڑا فرق واقع ہوگا جس زمانے میں عربی کی مخالفت زوروں پر تھی تو صادرہ کی جگہ فرستادہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ صادرہ کی جگہ فرستادہ کا لفظ اس کے اصل معنی نہیں دیتا۔ فرستادہ کا ترجمہ ارسال ہو سکتا ہے۔ تاجر جب کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے ہیں تو وہ اسے "مراسلہ" کہتے ہیں۔ یعنی ارسال شد۔ جانور اگر پیاسا ہو اور وہ پانی پینے کے لیے نکلے تو جانور کی اس حالت کو صدور کہتے ہیں۔ اس جگہ سے صادر ہوا یعنی نکلا۔ بعد میں اس لفظ کے معنی میں عمومیت پیدا ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے اس روز لوگ زمین سے صادر ہوں گے یعنی نکلیں گے۔ جیسے کوئی فرمان ایک مقام سے صادر ہوتا ہے یا شناخت نامہ کسی ایک جگہ سے صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح لوگ صادر ہوں گے یعنی نکلیں گے۔

کیوں نکلیں گے ؟

اس کا جواب بھی عجیب ہے :

" لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ "

" تاکہ ان کے اعمال انھیں دکھائے جائیں "

یعنی لوگوں کو اعمال کی نمائش گاہ میں لے جایا جائے گا تاکہ وہ چھوٹے بڑے تمام اعمال جو انسانوں نے اس دنیا میں اپنی اوائل عمر سے لے کر آخر عمر تک انجام دیے ہیں انھیں مجسم کر کے موجود کر دیا جائے۔ انسان کی کیا حالت ہوگی جب اسے اعمال کی نمائش گاہ میں لے جائیں گے ؟

تاریک اور سیاہ اعمال، آگ، سانپوں اور بچھوؤں کی شکل میں مجسم ہوں گے۔

اس کے برعکس جب لوگوں کو جزائے حسنِ عمل کی نمائش گاہ میں لے جایا جائے گا تو وہ اچھے کاموں کو مجسم صورت میں دیکھیں گے جو بہت خوبصورت ہوں گے۔ اگر عالم قیامت میں موت کی گنجائش ہوتی تو اہل سعادت خوشی کے مارے اور اہل شقاوت رنج و غضب کے مارے ہلاک ہو جاتے۔

یعنی اتنی خوشی اگر دنیا میں انسان کو ملے تو وہ شادی مرگ ہو جائے اور اس قدر غم سے دنیا میں ملے تو اسی وقت اس پر سکتہ طاری ہو جائے اور وہ مر جائے۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا
لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۔

بعد میں لیروا اعمالھم کی قرآن اس طرح توضیح کرتا ہے

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ

وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهٗ ۔"

" پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو
دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی
وہ اس کو دیکھ لے گا۔"

مادّہ کی سب سے چھوٹی اکائی کو عربی زبان میں ذرّہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ جسم کہ جس سے چھوٹا جسم کوئی نہیں ہے۔ اسے انسان ننگی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ ذرات کو آفتاب کی روشنی میں رہ کر یا سائے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

البتہ کسی کمرے میں آفتاب کی شعاعیں آرہی ہوں اور روشنی کا ایک ستون سا بن گیا ہو تو اس ستون کے اندر چھوٹے چھوٹے بے شمار ذرات کو متحرک دیکھا جا سکتا ہے۔ ان ہی کو عربی زبان میں ذرہ کہتے ہیں۔ یعنی سب سے چھوٹا جسم۔

علماء اور فلاسفہ جسم کی ماہیت پر بحث کرتے رہے ہیں اور غور کرتے رہے ہیں کہ جسم کن چیزوں سے مل کر بنتا ہے؟

دانشوروں کی ایک تعداد کا نظریہ یہ تھا کہ ہر جسم بہت ہی چھوٹے اجسام سے مل کر بنتا ہے (بعد میں آنے والوں نے اسی نظریے کی تائید کی)۔

ان انتہائی چھوٹے چھوٹے اجسام کو جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے ذرات کہا گیا۔

" ذرات صغار صلبہ "

انتہائی چھوٹے اور بہت سخت ذرات۔

ان دانشوروں کا خیال تھا کہ ایسے ذرہ کو نہیں توڑا جا سکتا۔ اور

ناقابل تقسیم ہوتا ہے۔ اسی ذرہ کو بعد میں ایٹم کا نام دیا گیا۔

بہرکیف قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص ذرہ برابر بھی بدی کرے گا تو وہ اس کی جزا دیکھ لے گا۔

اب آپ سورۃ کے معنوں پر توجہ کے ساتھ اس کے آہنگ پر بھی توجہ دیجیے۔

والسّلام

حضرت
امام جعفر صادق علیہ السلام
نے فرمایا:

○ —— جب تمھارے اوپر فتنے شبِ تاریک کی طرح ——
چھا جائیں ——
تو ——
تمھیں چاہئیے کہ قرآن سے متمسک ہو جاؤ۔

○ —— جس نے قرآن کو اپنے آگے کیا ——
تو ——
قرآن نے جنت تک اس کی قیادت کی۔
جس نے قرآن کو پیچھے کیا ——
تو قرآن نے اس کو دھکیل دیا جہنم تک۔

عادیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِيْرٰتِ
صُبْحًا ۙ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ
اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ وَاِنَّهٗ عَلٰى
ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۚ
اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ وَحُصِّلَ
مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ
لَّخَبِيْرٌ ۠

سورۃ "والعادیات" کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے یا مدنی؟ قرائن کے اعتبار سے یہ اختلاف پیدا ہوا ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی یا مدینہ میں۔ روایتوں کی رو سے بھی شبہ کے اسباب

پیدا ہوئے۔ اس سورت کا آہنگ اور اس کا چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل ہونا سے مکی سورتوں سے مشابہ بناتا ہے۔

مکی سورتیں وہ ہیں جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی دور بعثت میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ مکی سورتیں اور ان کی آیات یاد دہانی کرانے والی، ڈرانے والی اور جھنجوڑنے والی ہیں۔

مدنی سورتوں میں سے اکثر میں قوانین اور ضوابط بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے طویل اور مفصل آیات ان سورتوں میں آئی ہیں۔

یہ سورت چند قسموں سے شروع ہوتی ہے۔ عجیب قسمیں! انھیں قسموں کی بنا پر ایک گروہ اسے مکی سورت قرار دیتا ہے۔ عام طور پر قرآنوں میں اس سورہ کو مکی ہی لکھا جاتا ہے۔ میں بھی اس کے مکی ہونے کا قائل ہوں۔

میری یہ رائے ہے بلکہ قطعیت کے ساتھ میں اسے مکی ہی کہتا ہوں جبکہ بعض لوگ جیسے تفسیر المیزان کے مولف کہتے ہیں اس کے مضمون کے قرینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے۔

قسمیں، عجیب قسمیں ہیں، ذرا توجہ سے سنیے، ارشاد ہوتا ہے:

"وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا۔"

دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم۔ اس حال میں کہ وہ پھنکاریں مار رہے ہیں، مجاہدوں اور سربازوں کے گھوڑوں کی قسم۔

ان گھوڑوں کی قسم جو سخت اور پتھریلی زمینوں پر دوڑتے ہیں

ہم جیسے دیہات کے رہنے والے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ گھوڑوں کے سموں میں اگر نعل لگے ہوئے ہوں اور وہ سخت پتھریلی زمین پر دوڑیں تو نعل اور پتھروں کی رگڑ سے چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چھوٹی

چھوٹی بجلیاں چمک رہی ہوں۔

ارشاد قرآنی ہے :

"فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا"

"وہ گھوڑے جو پتھریلی زمینوں پر دوڑتے ہوئے
اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں جھاڑتے ہیں"

"فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا"

"وہ گھوڑے جو صبح سویرے دشمن پر چھاپہ مارتے ہیں"

یہاں گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے، لیکن یہ خود گھوڑے سواروں کی تعریف ہے۔ جب سرباز کے گھوڑے کی قسم کھائی جاتی ہے تو خود سرباز کی بھی عزت افزائی ہوتی ہے۔ یہ سرباز وجاں نثار اپنے گھوڑوں کو لے کر اس برق رفتاری کے ساتھ چھاپہ مارتے ہیں کہ دشمن ابھی اپنی لشکر گاہ میں ہی ہوتا ہے کہ اس کے سر پہ پہنچ جاتے ہیں۔

"فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا"

اس سے قبل یہ فرمایا تھا کہ گھوڑے اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں جھاڑتے ہیں ظاہر ہے کسی پتھریلی زمین پر ان کی دوڑ کا ذکر تھا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا تھا

"فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا"

صبح سویرے دشمن پر چھاپہ مارتے ہیں۔

پھر اس موقع پر گرد وغبار اڑاتے ہیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ دشمن سنگلاخ زمین پر پڑاؤ نہیں ڈالتا۔ وہ دشت میں کسی میدانی جگہ پہ قیام کرتا ہے۔ اور یہ سرباز شبخون مارنے کے لیے کوئی کوہستانی راستہ اختیار کرتے ہیں تاکہ دشمن ان کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ پھر وہ اچانک میدانی علاقے میں داخل ہو کر اس پہ

ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دشمن بھی فوراً مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس قدر گرد و غبار آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

فردوسی کہتا ہے:

زسم ستوران دراں پہن دشت
زمین شد شش و آسمان گشت ہشت

اس طرح گھوڑے دشمن کے ہجوم میں گھس جاتے ہیں اور اس کے لشکر کے عین درمیان پہنچ جاتے ہیں۔

قرآن اس آیت میں کیا کہنا چاہتا ہے۔؟

قرآن ان جملات کے ساتھ کیوں قسم کھاتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ چیزیں میرے نزدیک مقدس ہیں۔ مجاہدین کے گھوڑے، ان گھوڑوں کی ٹاپیں وہ گرد و غبار جو ان سے پیدا ہوتا ہے۔ راتوں رات کیے جانے والے حملے جو ایک بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں یا جو حملے دشمن پر اچانک کیے جاتے ہیں۔

ہماری روایات میں آیا ہے اس سورہ کی شان نزول کا تعلق ایک غزوہ سے ہے جسے "ذات السلاسل" کہتے ہیں۔ غزوہ ذات السلاسل کا تعلق اس زمانے سے ہے جبکہ دشمن نے دنیائے اسلام پر بڑا ہجوم کر رکھا تھا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند بار مسلمانوں کو ان کے مقابلہ کے لیے روانہ فرمایا۔

ایک بار حضرت ابوبکر کی سرکردگی میں اور دوسری بار حضرت عمر کی سرداری میں۔ عمرو بن العاص نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:

"یارسول اللہ! اسے ہم حیلہ و تدبیر سے ختم کرتے ہیں"

وہ بھی گئے اور میدان کارزار کو بڑی مشکلات سے دوچار کر دیا۔ آخر یہ کام حضرت علیؑ کے سپرد کیا گیا۔

علیؑ نے کوہستانی راستہ منتخب کیا۔ رات اس راستے پر سفر کرتے رہے اور صبح سویرے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا۔

اس روز کہ اس جگہ سے مدینہ کا فاصلہ زیادہ تھا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کی مسجد میں آئے۔ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور حمد کے بعد سورۃ عادیات پڑھی۔

یہ سورت بھی سورہ زلزال کی طرح قیامت کی یاد دہانی کراتی ہے اور خدا کی طرف لوٹنے کے احساس کو بیدار کرتی ہے۔ یہ سورہ انسان میں سپاہیانہ جذبے کو بیدار کرتی ہے۔ اس سپہ گری میں عربوں کا کردار بڑا حیرت انگیز ہے۔

مسلمانوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ حمد پڑھنے کے بعد ایک نئی سورت کی قرأت فرمائی کہ اس سے پہلے آپ نے یہ سورہ نہیں پڑھی تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ . . . .

جب نماز ختم ہوگئی۔ لوگوں نے کہا:

"ہم نے یہ آیات اب تک آپ سے نہیں سنی تھیں۔ ان آیات کو پہلی بار ہم آپ سے سن رہے ہیں۔"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"آج ہی مجھ پر جبرئیلؑ نازل ہوئے اور اطلاع
دی کہ علیؑ اس جگہ اس مقام پر گئے اور فتح حاصل
کرکے واپس ہو گئے۔

(تمام مسلمان واقف تھے کہ ایک عرصے سے مشکل درپیش تھی)

قرآن جب کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ اس چیز کا احترام کرتا ہے۔ اسے مقدس سمجھتا ہے۔

اس کے بعد کیا ارشاد ہوتا ہے؟

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ۔"

"حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا
ناشکرا ہے۔"

بجائے اس کے کہ نعمت کی قدر جانے۔ سینہ زوری کا رویہ اختیار کرتا ہے اس کا حال ایک ضدی بچے کی طرح ہوتا ہے۔ ماں باپ اس کی بہبود اور شفا کیلیے کوئی دوا یا غذا تیار کرتے ہیں۔ لیکن وہ توڑ پھوڑ کر کے اسے پھینک دینا چاہتا ہے۔

مفسرین نے کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے کہ قرآن نے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ" کہتے ہوئے ان ہی لوگوں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے کہ ایک پیغمبرؐ ان کے درمیان مبعوث کیا گیا۔ بجائے اس کے کہ اس کی دعوت قبول کریں انھوں نے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا۔ قرآن کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے تمھیں یہ نعمت عطا کی۔ کیا یہ نعمت کی قدر دانی ہے کہ مدینہ پر حملہ کرنے کی فکر کرتے ہو؟!

(اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ)

"کنود" یعنی کنور، یعنی کفرانِ نعمت، منحرف، حق ناشناس
"وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ"۔

"اور وہ خود اس پر گواہ ہے":

اگر خود اسی سے پوچھا جائے تو اس کی فطرت تصدیق کرے گی کہ وہ ایک کافرِ نعمت اور حق ناشناس وجود ہے۔

"وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ"۔

اس آیت کے معنی دو طرح سے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ لشدید لحب الخیر، یعنی وہ دولت سے بہت محبت کرتا ہے، دوسرے یہ کہ انسان بہت شدید ہے، گویا بہت بخیل ہے، کیوں؟

اس لیے کہ دولت سے بہت محبت کرتا ہے۔

یہاں قرآن نے دولت کو خیر سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تعبیر قرآن میں بار بار آئی ہے۔ اس نے ثروت کو خیر کا نام دیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

اِنْ تَرَكَ خَيْرًا

خود دولت اپنی ذات میں شر نہیں ہے۔ انسان کی دولت سے محبت شر ہے۔ انسان کو اس سے رہائی حاصل کرنی چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے سوا کسی سے وابستگی نہ رکھے۔ اصل چیز تعلق اور وابستگی ہے۔ جیسے گھوڑے کے منہ میں لگام دیتے ہیں اور پھر لگام کو کسی چیز سے باندھ دیتے ہیں۔ یعنی گھوڑے کو کسی درخت سے یا اس کے کٹہرے میں باندھ دیتے ہیں اس طرح خود کو کسی چیز سے نہیں باندھ لینا چاہیے۔ غیر اللہ کے ساتھ بستگی عین خدا

سے آزادی حاصل کرنا ہے۔

انسان ایک ایسا موجود ہے جو لامتناہی ہے ، انسان جس قدر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوگا ، اس کے سامنے راستہ کھلا رہے گا۔ وہ جس قدر آگے بڑھتا جائے گا اسے راستہ کھلا ملے گا۔ اگر وہ ابد تک چلتا رہے تب بھی راستہ ختم نہیں ہوگا۔

دولت ، آج کی اصطلاح میں انسان کو استحکام دیتی ہے ۔ اسے مضبوط بناتی ہے ——— ، اس کی حفاظت کرتی ہے ، اسے ترقی و تکمیل کی راہ پر بڑھاتی ہے اسی لیے دولت کو قرآن میں خیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دولت بذات خود بری چیز نہیں ہے ۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے ؟

" اگر دولت بری چیز ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نے کیوں انسان کے اختیار میں دیا ۔ ؟ "

اس کا جواب یہ ہے :

" دولت بری چیز نہیں ہے البتہ اس کے ساتھ تیرا تعلق ، تیرا حب الخیر ، (حب یعنی تعلق اور محبت) برا ہے ۔ تجھے یہ نہیں چاہیے کہ خود کو اور اپنی گردن کو دولت کے ساتھ باندھ دے اور کھڑا ہو جائے ۔ "

دوسری بات یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے خیر کی محبت کو انسان کی فطرت میں مطلق طور پر رکھا ہے اور خیرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے ۔ خیر مطلق کو تو تو نے چھوڑ دیا اور ایک محدود اور جزئی چیز کے پیچھے پڑ گیا جسے صرف ایک ذریعہ اور وسیلے کی حیثیت حاصل ہے ۔ تو نے ذریعے کو ہدف بنا لیا ۔ اور اصل ہدف کو بالکل بھلا دیا ۔

" اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۔ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ۔

"تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا، جب
قبروں میں جو کچھ ہے اسے نکال لیا جائے گا
اور سینوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اسے برآمد
کرکے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔"

یعنی جو کچھ انسان کے باطن میں ہے اسے ظاہر کر دیا جائے گا۔ کیا انسان نہیں جانتا کہ اس وقت کیا ہوگا؟ کیا اُسے نہیں معلوم کہ یہ وقت آنے والا ہے؟

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ۔"

اگر وہ نہیں جانتا تو اب جان لے کہ اس کا پروردگار خبیر و آگاہ ہے۔ وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

وَالسّلام

حضرت
امام جعفر صادق علیہ السلام
نے فرمایا :

قرآن زندہ ہے ——،
ختم نہیں ہوا —— اسی طرح جاری وساری ہے
جیسے دن —— رات اور ——
چاند، سورج،
یہ ہمارے بعد آنے والوں پر بھی اسی طرح ——
منطبق ہوتا ہے ——؛
جیسے —— ہم سے پہلوں پر ——

عصر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

ہماری گفتگو کا موضوع سورہ مبارک 'عصر' ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی دو سطر کی سورۃ ہے۔

قرآن میں تین بہت چھوٹی سورتیں ہیں۔ سورہ کوثر، سورہ توحید (اخلاص) اور عصر۔ 'والعصر' میں کل تین آیتیں ہیں لیکن یہ ایک ایسی سورۃ ہے کہ اس کے مضامین پر پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس کی بنیادی باتیں میں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

یہ سورۃ ان سورتوں میں سے ہے جن کا آغاز قسم سے ہوا ہے۔

"وَالْعَصْرِ"

"عصر کی قسم"

یہ آیت صرف دو کلموں پر مشتمل ہے۔ "و" اور "عصر" قرآن کی قسموں کے بارے میں ہم کافی گفتگو کر چکے ہیں۔ میں ان کی تکرار نہیں کروں گا، صرف وہ باتیں بیان کروں گا جو اس سورہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن کی بہت سی قسموں میں سے چند کا تعلق زمانے سے ہے۔ یہ قسمیں مختلف ہیں:

دن کی قسم (والنہار)

رات کی قسم (واللیل)

دن کے کسی حصے کی قسم (والضحیٰ)

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ان میں سے ہر ایک اپنے اندر کوئی حکمت اور فلسفہ لیے ہوئے ہے۔ جو بڑا اہم اور قابلِ بیان ہے۔

دن اور رات دو طلوعوں کے درمیان کا وقت اور دوپہر کا وقت۔ انھیں کس طرح کی اہمیت حاصل ہے۔؟

اس سورۃ کی پہلی آیت والعصر ہے جو صرف دو کلموں "و" اور "عصر" پر مشتمل ہے اور اس کے معنی زمانے کے ہیں۔

عصر سے کیا مراد ہے؟ اس کلمہ کے زیادہ تر دو مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ ایک مطلب دن کا وہ مخصوص حصہ جسے ہم عصر کہتے ہیں یعنی دن کا آخری چوتھائی حصہ جو دوپہر کے مقابل ہے۔[1]

---

[1] "ضحیٰ" اس وقت کو کہتے ہیں جب آفتاب کافی بلند ہو جاتا ہے اور ہر طرف خوب روشنی پھیل جاتی ہے اس وقت دن دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دوسرا آدھا حصہ ظہر کے بعد شروع ہوتا ہے اسے بھی نصف کر دیں تو دن کا چوتھائی ہو گا۔ جسے "عصر" کہتے ہیں

دوسرا جو مطلب بیان کیا گیا ہے اس کی رو سے یہاں دن کا ایک حصہ مراد نہیں ہے بلکہ تاریخ کا ایک حصہ مراد ہے۔ مثلاً عصر پیامبر، پیامبر کے زمانے سے مراد تاریخ کا وہ خاص حصہ ہے جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی گزاری ہے۔ پھر تاریخ کی بھی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں۔ ہر گروہ نے اپنے فن کی مناسبت سے تاریخ کو مختلف ادوار اور زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔

مثلاً ایک گروہ نے جس کی نظر میں اجتماعی زندگی اور اقتصادی روابط کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اس نے تاریخ کے ادوار کی تقسیم کچھ اس طرح کی:

غلامی کا زمانہ۔

جاگیرداری کا زمانہ

سرمایہ داری کا زمانہ

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے جس کی نظروں میں فن اور آلات ووسائل کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اس نے تاریخ کی تقسیم کچھ اس طرح سے کی:

پتھر کا زمانہ،

لوہے کا زمانہ،

ایٹم کا زمانہ،

خلائی وسائل کا زمانہ۔

اسی طرح کی کچھ دوسری تعبیرات کی جاتی رہی ہیں۔

اس سورۃ میں عصر سے مراد عصر پیامبر ہے یعنی قسم ہے اس زمانے کی جو پیغمبر کا زمانہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ زمانے کے مختلف اجزا میں کوئی فرق وامتیاز نہیں ہوتا۔ زمانہ ایک ہی ہے جو ازل سے شروع ہو کر ابد پر ختم ہوتا ہے اور

زمانے کے اجزا میں باہم کوئی فرق نہیں ہے لیکن انسان اور زمانے کے تعلق سے فرق پیدا ہوتا ہے کیونکہ زمانے کا تعلق انسان سے ہے اور انسان کا تعلق زمانے سے۔ ایک زمانہ وہ ہے جسے انسان کی انسانیت اور اس کے پروان چڑھنے کا اور انسان کے عروج و کمال کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے زمانے کا یہ دور کافی تقدیس پیدا کر لیتا ہے۔

قرآن جب اس دور اور زمانے کی اہمیت ظاہر کرنا چاہتا ہے تو اس کی قسم کھاتا ہے اور فرماتا ہے:

"عصرِ پیغمبر کی قسم"

اس اعتبار سے ہماری تاریخ کے بعض زمانے بعد میں آنے والے زمانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی وہ دوسرے زمانوں کو بنانے والے ہیں۔ انھیں وہ اچھا بنائیں یا برا بنائیں۔

جب کوئی اچھا زمانہ آتا ہے تو وہ ان خوبیوں کی ماں بن جاتا ہے جو اس کے بطن سے پیدا ہو کر تاریخ کے سارے طویل عرصے پر پھیل جاتی ہیں یا وہ طویل تاریخ میں خوبیوں اور سعادتوں کی بنیاد بن جاتا ہے۔

انسان جب ایسے اچھے دور پر نگاہ ڈالتا ہے اور اس عصر کا جائزہ لیتا ہے اور جو کچھ اس میں ظاہر ہوا اس کو دیکھتا ہے تو وہ اس کے لیے الہام بخش خیر، نیکی اور حرکت و سعادت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

لیکن صورتِ حال اس کے برعکس اور مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی تاریخ کے ادوار میں سے ایک دور ایسا بھی ہو سکتا ہے جو سیاہ، غلیظ اور کثیف ہو اور اس کے بطن سے برائیاں ہی پیدا ہو کر پوری تاریخ کو گندہ کریں۔

"والعصر"، عصرِ نورانی کی قسم! اس بابرکت زمانے کی قسم، وہ زمانہ

کہ جس میں برکت نازل ہوئی ۔ برکت کا یہ زمانہ ۲۳ سال پر پھیلا ہوا ہے۔ اس ۲۳ سال کے عرصے میں قرآن نازل ہوا اور قرآن اسی زمانے کی قسم کھاتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔

یعنی بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔

میں نے یہ بات کئی بار کہی ہے کہ انسان شناسی کی مسلمہ بنیاد اور قرآن کی مسلمہ بنیاد۔ دونوں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ انسان اور دنیا کی تمام موجودات کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے ۔ خواہ یہ موجودات جاندار ہوں یا بے جان ۔ دنیاوی اور طبیعی ہوں یا مافوق دنیائی و مافوق طبیعی انسان ایک بالقوہ مخلوق کی حیثیت سے دنیا میں آیا ہے کسی موجود بالفعل کی حیثیت سے نہیں ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اگر آپ اس کے جسمانی ڈھانچے پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک کامل موجود کی حیثیت سے وجود میں آتا ہے یعنی پوری طرح تیار دنیا میں آتا ہے ۔ بطن مادر سے باہر قدم رکھنے سے قبل ہی اس کی بصارت ، سماعت ، تنفس ، خون اور دوران خون کا پورا نظام اور اس کے ہاتھ پاؤں سب بنا دیے جاتے ہیں ۔ یہ جسم مکمل تیار کیا جاتا ہے جس طرح کوئی موٹر کار کارخانے سے تیار ہو کر باہر نکلتی ہے لیکن اس بدن کا نام انسان نہیں ہے ۔ یہ بدن انسان کا ڈھانچہ اور شخص ہے انسان ایک شخصیت رکھتا ہے اور اس کی یہ شخصیت پیدا ہونے کے بعد آہستہ آہستہ بننے لگتی ہے ۔ پیدائش کے وقت انسان شخصیت کے اعتبار سے ہر حیوان سے ضعیف تر ہوتا ہے۔

آپ بلی کے بچے ہی کو دیکھیے ، یہ عملی و فعلی اعتبار سے انسان کے بچے سے

آگے ہوتا ہے۔ اسے اس قدر ہوش و فہم حاصل ہوتا ہے کہ وہ خود زندگی بسر کر سکتا ہے۔ صرف بلی کا بچہ ہی نہیں، گائے کا بچہ، گدھے کا بچہ ہوش و فہم میں کم ہونے کے باوجود انسان کے بچے سے آگے ہوتا ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا [1]

شخصیت کے اعتبار سے انسان کے بچے کی زندگی صفر سے شروع ہوتی ہے اور بتدریج ماں باپ کا ماحول اور معاشرہ کے سائے میں اس کی شخصیت کا ایک سراپا تیار ہوتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ رشد و بلوغِ فکر اور اختیار و انتخاب کے مقام پر پہنچتا ہے۔ پھر وہ خود کسی راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا سب سے اہم مرحلہ ہے۔

یہاں ہم انسان اور غیر انسان کے درمیان ایک بنیادی فرق تک پہنچتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو بن کر اور ڈھل کر دنیا میں آتی ہے تو اسے اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو باہر سے پہنچتا ہے۔ مثلاً حیوان کو یہ نقصان پہنچ سکتا ہے کہ غذا اس تک نہ پہنچے۔ یا کوئی باہر سے اسے ضرب لگائے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کو کاٹ دے اور اس کو قتل کر دے۔

یہ نقصان پہنچانے والا عامل بیرونی ہے۔ باہر سے کسی چیز نے اسے نقصان پہنچایا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ کوئی چیز باہر سے انسان کو نقصان پہنچائے اس کا اولین نقصان تو یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو ٹھیک طرح سے نہ بنائے اور اسے خسران سے دوچار کر دے۔ انسان اپنی شخصیت کی تعمیر کا خود ذمہ دار ہے

---

[1] سورۂ نساء آیت ۲۸

یعنی وہ ایک بالقوہ انسان ہے۔

خلقت وجبلت نے بلی کو بلی بنایا ہے اور کتے کو کتا۔ یعنی اسے کتے کی صورت میں وجود دیا اور چوہے کو بھی اس کی خلقت نے چوہا بنایا ہے شمعدانی (ایک قسم کا درخت) کے پھول کو بھی خلقت ہی نے شمعدانی کا پھول بنایا ہے۔

صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو اگر یہ چاہتی ہے کہ اپنی نوع کا مجسم معنوں میں مصداق بنے تو اسے خود ہی اپنے ہاتھوں خود کو انسان بنانا ہوگا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اسے بڑے بڑے نقصانات پہنچیں گے۔

اب یہ دیکھیں کہ انسان کس چیز سے انسان بنتا ہے؟ انسان کے انسان بننے کے کیا معنی ہیں؟

جسم ——— ؟

جسم تو ایسی چیز ہے جو انسان اور حیوان میں مشترک ہے۔

تن آدمی شریف است نہ جان آدمیت
نہ ہمین لباس زیباست نشانِ آدمیت

اگر آدمی بہ چشم است ودہان وگوش وبینی
چہ میان نقش دیوار ومیان آدمیت

آدمی صرف یہ جسم نہیں ہے۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ آدمی اور آدمی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

اجسام شناسی کے اعتبار سے ابوجہل اور پیغمبر کا جائزہ لیجیے۔ کیا پیامبر کے دو دل ہیں اور ابوجہل کا ایک؟

نہیں، جسم کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن موسیٰؑ اس لیے کہ موسیٰ ہیں اور فرعون، فرعون ہے دونوں کے درمیان

فرق ہے یعنی شخصیت موسوی اور شخصیت فرعون میں زمین آسمان کا فرق ہے ابوذر اور معاویہ کا موازنہ کیجیے۔ ابوذر اور معاویہ اگر کسی مجلس میں آئیں تو انھیں کوئی نہ پہچانے۔ کیا ابوذر کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔ کہ یہ ابوذر ہیں؟ ممکن ہے کہ لوگ شبہے میں پڑجائیں کہ دونوں میں سے ابوذر کون ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوذر ایک دوسری جنس اور ایک دوسرا وجود ہیں اور معاویہ کا بھی یہی حال ہے۔ اس کا تعلق دراصل ان دونوں کی شخصیت سے ہے۔

انسان خود اپنا ذمہ دار ہے، وہ خود کو انسان بنانے اور انسان بننے کا ذمہ دار ہے۔

انسان کس چیز سے انسان بنتا ہے ــــــ؟

انسان خود اپنے عمل سے اپنی تعمیر کرتا ہے۔ اس کے عمل کی نوعیت اسے انسان بناتی ہے لیکن ایک قسم کا عمل ایسا ہوتا ہے جو انسان کو انسانیت سے خارج کردیتا ہے۔ اور ایک دوسری قسم کا عمل اسے انسانیت سے قریب کردیتا ہے۔ یہ وہ فکر ہے جسے قرآن نے چودہ سو سال قبل ہی کامل طریقے پر پیش کردیا تھا۔ سورۂ "والمرسلت" میں اس موضوع پر میں نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

لیکن قرآن کی نظر میں انسان کی انسانیت دو چیزوں سے ہے:

ایک ایمان اور دوسرے عمل۔

ایمان خود ایک رکن اور اساس ہے۔ موجودہ دور کے فلسفوں میں ایمان کی اصل اور ذاتی قدر وقیمت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ وہ اچھی فکر اور اچھے ایمان کو ضروری تو سمجھتے ہیں لیکن صرف ذہنیت میں۔ وہ کہتے ہیں ایمان کا تعلق ذہن سے ہے اور ذہن کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ انسان کو عمل پر آمادہ

کرتا ہے یعنی ذہن کو اولیت کی اہمیت حاصل ہے۔ صدر اسلام میں بھی بعض لوگ اسی اعتقاد و فکر کے حامل تھے۔ خوارج انہیں میں سے تھے۔

قرآن کا نظریہ یہ قطعاً نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے خدا کو پہچاننا ہر عمل سے قطع نظر ایک عمل ہے (البتہ خدا شناسی کا منشا عمل ہے) بالفرض خدا شناسی کا عمل ہر دوسرے عمل سے جدا ہو جائے۔ اس صورت میں اگر ہم اس خدا شناسی کے عمل کو انسان کی پوری انسانیت نہ کہیں اسے انسان کی نصف انسانیت تو کہہ سکتے ہیں۔

خدا پر ایمان ــــــ یعنی ــــ اوّل پر ایمان۔

معاد پر ایمان ــــــ یعنی ــــ آخر پر ایمان ــــــ اور

وسط پر ایمان (دنیا)۔ یہ ایمان عمل پر کیا نقش جماتا ہے اور ہمیں اس دنیا میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیئے۔

قرآن کی رو سے اس مسئلے کو سمجھنا کچھ اس طرح سے ہے۔ قرآن ایمان اور عمل کی علیحدگی ناقابل قبول قرار دیتا ہے۔ آپ دیکھیے قرآن میں اس کی کس قدر تکرار کی گئی ہے۔

"آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ"

ان جملوں کی اس قدر تکرار ہوئی ہے کہ انسان جہاں بھی "آمَنُوا" پڑھتا ہے، اس کے بعد "عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" کا انتظار کرتا ہے کہ یہ فقرہ اس کے بعد ضرور آئے گا۔ ہمارا یہ کہنا درست نہ ہوگا:

"ایمان کو مضبوط اور محکم رکھو۔ عمل کرو یا نہ کرو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"واعبد ربك حتى يأتيك اليقين"

"اپنے رب کی اس قدر عبادت کر کہ تو یقینی ایمان

کے درجہ پر پہنچ جائے۔"

جب تو اس مقام و مرحلے میں پہنچ جائے گا تو یہاں شیطان کے وسوسے کا گزر نہیں ہوگا جو یہ کہتا ہے:

"عمل چھوڑ دے اس کا کیا فائدہ؟"

اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں (جیسے صدر اسلام کے خوارج) جو عمل پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ایمان کا ہونا نہ ہونا ان کے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں اس لیے وہ کہتے ہیں:

"دنیا میں جہاں بھی ایسے لوگ ہوں جو مسلمانوں کی طرح عمل کرتے ہوں، خواہ وہ خدا کو نہ پہچانتے ہوں خواہ وہ آخرت پر یقین نہ رکھتے ہوں، چونکہ ان کا عمل اچھا ہے وہ اس چیز تک پہنچ گئے ہیں جس کی طرف پیغمبر دعوت دیتے تھے۔ انھیں دنیا و آخرت کی سعادت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایمان بس مقدمہ ہے۔ یعنی عمل سے پہلے ہے!"

ایمان ہرگز مقدمہ نہیں ہے، نہ ایمان مقدمہ ہے نہ عمل بلکہ دونوں رکن ہیں اور دونوں انسان کی سعادت کے لیے ضروری ہیں۔

آپ نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جس کی شخصیت بنی بنائی وجود میں نہیں آئی ہے۔ اس کا اصل نقصان اسی بات سے وابستہ ہے۔ اگر وہ اپنی شخصیت کی اچھی طرح تعمیر چاہتا ہے تو دو چیزیں ممکن العمل ہیں۔ ایک نظری اور دوسرے عملی۔ ایک کا تعلق شناخت سے ہے اور دوسرے کا عمل سے۔

جو چیز کہ نظری اور جس کا تعلق شناخت سے ہے اس کا نام ایمان ہے ایمان اللہ پر، انبیاء پر، ملائکہ پر، اور کتابوں اور رسولوں پر اور یوم آخر پر ایمان اور امام و رہبر پر، ان چیزوں کا شمار اصول دین میں ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ان مسائل کی پہچان اور شناخت ہے اور اعتقاد ہے اور ان کا ادراک ہے بعد میں عمل بھی۔

انسان نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور عملِ صالح کیے۔

عمل صالح کیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

فقہا اور اصولیین اس کی ایک تعبیر کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"عناوین اولیہ" اور "عناوین ثانویہ"

یعنی ایک چیز کو وہ کبھی اس کے اصل عنوان سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں نماز۔ نماز اس عمل کا نام یا عنوان ہے۔ ہم لوگوں کے ساتھ احسان کا ذکر کرتے ہیں۔ احسان اس عمل کا نام ہے۔ ہم زکوٰۃ کہتے ہیں۔ زکوٰۃ اس عمل کا نام ہے۔ ہم روزہ کہتے ہیں۔ روزہ اس عمل کا نام ہے۔ ہم جہاد، امر بہ معروف ونہی از منکر، انفاق، راستی وصداقت کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ ان اعمال کے نام ہیں...... لیکن آپ جانتے ہیں کہ موقع ومحل کے اعتبار سے اشخاص وافراد کے احوال اور زمانے کے شرائط کے اعتبار سے اعمال کی کیفیت ونوعیت میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔

یہ کس طرح ہوتا ہے؟

یعنی کوئی کام کسی وقت تمھارے لیے امر واجب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دوسرے وقت وہی کام مستحب قرار پاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور وقت اس مستحب میں بھی فرق واقع ہو جائے۔

اس کی یہ مثال لیجیے:

آپ کسی قرض خواہ کے مقروض ہیں شرعاً آپ قرض دار ہیں اور وہ قرض خواہ ہے۔ قرض خواہ آپ سے سختی کے ساتھ اپنا قرض واپس مانگتا ہے اور کہتا ہے:

"مجھے روپوں کی شدید ضرورت ہے۔ ابھی میرا قرض ادا کر دو"

آپ کہتے ہیں:

"بھائی صبر کرو، میں ذرا نماز تو پڑھ لوں اور پھر میں آپ کا قرض ادا کر دیتا ہوں"

وہ کہتا ہے:

"میں اتنا بھی صبر نہیں کر سکتا۔ پہلے میرا قرض ادا کر اور پھر نماز پڑھ"

یا آپ نماز پڑھنا چاہتے ہی تھے کہ ایک مریض جو سخت تکلیف میں مبتلا ہے وہ آپ کے پاس آجاتا ہے۔ اور کہتا ہے:

"مجھے جلدی ڈاکٹر کے پاس پہنچاؤ"

ابھی آپ کے پاس نماز کے لیے کچھ وقت بھی موجود ہے۔ کیا اس مریض کو چھوڑ کر نماز پڑھنا عمل صالح ہے؟ آپ کی نماز اس وقت عمل صالح ہوگی کہ آپ پہلے قرض ادا کریں اور بعد میں اپنی نماز پڑھیں۔ اگر آپ بیٹھ گئے اور قرض خواہ سے بحث شروع کر دی اور اس سے یہ کہنے لگے:

"کیا تو خدا سے بھی بزرگ تر ہو گیا ہے؟ خدا تو تجھ سے بہت بڑا ہے میں تو اس کا قرض ادا نہیں کر رہا ہوں تو تیرا قرض کیسے ادا کر دوں، نہیں نہیں

پہلے میں فرض نماز ادا کروں گا۔

آپ غلطی پر ہیں۔ یہ نماز آپ کے لیے عمل صالح نہیں ہو گی جبکہ آپ کے پاس وقت بھی ہے۔ آپ جائیے پہلے فرض ادا کیجیے پھر نماز پڑھیے۔ اسی طرح آپ پہلے مریض کو ڈاکٹر کے پاس پہنچائیے اور پھر اپنی نماز ادا کیجیے۔

اسی کو عنوان ثانوی کہتے ہیں۔ عناوین ثانوی قابل تغیر ہوتے ہیں۔ اشخاص افراد کے احوال کے مطابق ان میں فرق واقع ہوتا ہے اور مسائل اجتماعی کے تعلق سے بھی۔ میں اب آپ سے ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہر شخص کو وہ کام کرنا چاہیے جس کی اس نے صلاحیت و اہلیت حاصل کی ہو۔

میں نے جو کچھ کہا ہے درست کہا ہے یا اس میں غلطی کی ہے۔ میں نے صحیح تشخیص کی ہے یا صحیح تشخیص نہیں کی ہے۔ ان دونوں میں سے خواہ کوئی بات ہو۔ میں نے چار لفظ پڑھے ہیں۔ ان کا درس لیا ہے، میں نے علم دین حاصل کیا ہے جس طرح آپ نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس عمر میں مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ جاؤں اور ڈاکٹر بنوں۔ نہ آپ تحصیلات دینی میں مصروف ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے ذمہ داریاں پوری کرنا بھی معاشرہ کے لیے ضروری و لازمی ہے۔ اسی طرح معاشرہ میں دینی ہدایت کی ذمہ داری پوری کرنا بھی لازمی ہے۔

لیکن آج مجھ پر کیا واجب ہے؟ وہی کام جو میں اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں۔ آپ کے لیے کون سا کام ضروری ہے؟ وہی جو آپ بہتر انجام دے سکتے ہیں۔

فرض کیجیے ایک شخص اقتصادیات کی تعلیم حاصل کرتا ہے اسے وزارت صحت میں کوئی عہدہ دیا جاتا ہے۔ ایک دوسرا شخص ڈاکٹری پڑھتا ہے اسے اٹھا کر وزیر اقتصادیات بنا دیا جاتا ہے۔ کاموں کے بگاڑنے کے لیے یہ ایک بڑی اچھی تدبیر ہے

عمل صالح وہ کام ہے جو فوری طور پر نہایت عمدگی سے انجام دیا جا سکے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ اس کام کو جانتے ہیں اور انجام دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کبھی خود اپنی خاص تعبیرات کے مطابق کلمہ صالح یعنی عمل شائستہ کے بارے میں مختلف اوقات و مواقع اور مختلف اشخاص و افراد کے اعتبار سے فرق کرتا ہے۔

مثلاً چند طالب علم چاہتے ہیں کہ جائیں اور تحصیل علم کریں۔ ان کی استعداد معلوم کی جاتی ہے۔ ایک ریاضی کی استعداد بڑی اچھی رکھتا ہے، ایک طبیعات کی اور ایک ادبی استعداد میں آگے ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے عمل صالح یہ ہے کہ وہ وہی کام انجام دے جس کی وہ استعداد رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک شخص رکھتا تو ہے ادبی استعداد لیکن وہ امور ریاضی کے پیچھے جاتا ہے۔ ایک دوسرا شخص ریاضی کی استعداد میں اچھا ہے لیکن وہ علوم ادبی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے لیے عمل صالح یہ ہے کہ وہ اپنے شعبے میں جائے۔

کلمہ عملوا الصالحات میں جہاں انسان سے یہ کہا گیا ہے کہ اسے عمل کرنا چاہیے وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا عمل ہر موقع و محل میں شائستہ بھی ہونا چاہیے۔ یعنی اسے یہ جاننا چاہیے کہ حالات و شرائط کیا ہیں اور ان میں وہ کیا کام انجام دینا چاہتا ہے اور بحیثیت مجموعی وہ اس کا تعین کرے کہ اس کی ذمہ داری کس نوعیت کی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

فی الواقع اس کلمے 'عملوا الصالحات' نے عمل کے مسئلے کو بھی بیان کیا ہے اور فرض شناسی کو بھی۔ یعنی مومنین ایسے عمل کرنے والے ہیں جو عمل کے وقت فرض شناس بھی ہوتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ موقع کو پہچانتے ہیں

کہ ان حالات و شرائط میں کون سا عمل بہتر و شائستہ ہوگا۔ اور کس چیز پہ عمل کیا جانا چاہیے۔

یہاں تک جو بات بیان کی گئی وہ یہ تھی کہ اے انسان تیرا خسارہ یہ نہیں ہے کہ باہر سے کوئی چیز تجھے ضرر پہنچاتی ہے۔ دوسری موجودات کے بارے میں تو یہ بات صحیح ہے اور تجھے بھی کوئی بیرونی عامل نقصان پہنچا سکتا ہے۔ لیکن ایسے کسی بیرونی ضرر سے پہلے تجھے ایک اور نقصان و خسران درپیش ہے۔

تیرا خسران یہ ہے کہ تو خود کو جیسا کہ اس بات کا حق ہے ایمان و عمل کے ساتھ ہم آہنگ نہ کرے اور خود کو ایک حقیقی انسان کی صورت میں نہ ڈھال سکے۔ لیکن کیا تیرا کام بس اسی پر ختم ہو جائے گا؟

نہیں ایسا نہیں ہے۔ ایک اور کام بھی ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔

پہلا حصہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ہے۔

اس جملہ میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ: اے انسان تیرا وجود ایک انفرادی وجود نہیں ہے۔ تو ایک اجتماعی وجود رکھتا ہے اور یہ خیال نہ کر کہ تو اکیلے ہی اپنے کمبل کو پانی سے باہر کھینچ سکتا ہے۔ یعنی اس ایمان و عمل کے تقاضوں کو تو تنہا پورے نہیں کر سکتا۔

اگر معاشرہ کے حالات اور ماحول کی شرائط صد فی صد خلاف ہوں تب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کام ناممکن ہے۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ کام کو جس طرح انجام پانا چاہیے وہ اس طرح انجام نہیں پا سکے گا۔ یا اس کے انجام دینے کے لیے انسان کی مشکلات میں سو فیصد زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ انسان پانی کے دھارے کے خلاف تیرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایک ماہر پیراک ہوگا تو ممکن ہے وہ تیر سکے۔ لیکن وہ کہاں تک

تیرے گا؟ دس میٹر، بیس میٹر، سو میٹر، زیادہ سے زیادہ ہزار میٹر تک تیرے گا اور پھر اس کا دم پھول جائے گا۔

اکیلے نہیں تو دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ....

"میں تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ دو، دو یا ایک ایک"

اگر تم کسی دوسرے آدمی کو اپنے ساتھ نہ لے سکو تو یہ خیال نہ کرو کہ تمھیں قیام نہیں کرنا چاہیے صرف دو ہی کافی نہیں، جاؤ کچھ اور آدمیوں کو تلاش کرو کم از کم دو یا تین آدمی ہونے چاہئیں۔ اگر یہ بھی نہ مل سکیں تو تم اس وقت تنہا اٹھ کھڑے ہو۔

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"

'تواصی' کا مادہ وصیت ہے۔ لغت فارسی میں وصیت کے معنی سفارش کے ہیں، عربی زبان میں بھی اس کے یہی معنی ہیں۔ اب سفارش زندہ انسان کے لیے ہو یا اس کی موت کے بعد ہو، سفارش ضروری ہے۔

امیرالمومنینؑ نہج البلاغہ میں مسلسل یہ فرماتے رہے ہیں:

"اوصیکم عباد اللہ ....."

"اے بندگان خدا میں تمھیں وصیت کرتا ہوں"

اس لیے نہیں کہ میرے مرنے کے بعد تمھیں کیا کرنا چاہیے، آپ نے وصیت کا لفظ سفارش کرتا ہوں کے معنوں میں استعمال فرمایا۔

"تواصوا" تواصی سے ہے۔ یعنی سفارش کرنا۔ باب تفاعل کے

تحت عربی اصطلاح میں، تفاعل کے باب میں تواصی وہاں کہا جاتا ہے جہاں ایک کام دونوں جانب سے انجام پائے۔

مثلاً عربی زبان میں کہتے ہیں " ضَرَبَ " یعنی مارا۔ اگر تم نے کہا " تَضَارَبَ " تو اس کا مطلب ہوگا:

" دو آدمیوں نے ایک دوسرے کو مارا "

یعنی ایک کام دونوں طرف سے انجام دیا گیا۔

" تواصی " یعنی دونوں طرف سے توجیہ کا عمل، دونوں جانب سے توصیہ۔ یعنی تمام افراد کا باہم ایک دوسرے کو توجہ کرنا اور باہم نگراں ہونا مثلاً یہ کہ میں ہمیشہ آپ کا نگراں رہوں اور آپ کی سرگرمیوں کو اپنی نظر میں رکھوں اور آپ کو یاد دلاتا رہوں کہ کہیں آپ غفلت کا شکار نہ ہوجائیں ...... بیدار رہو ...... محتاط رہو ...... یہی نگرانی کا عمل آپ میرے ساتھ کریں۔ اس طرح ایک دوسرے کی نگرانی کرے اور دوسرا کسی اور کی۔

یہ افراد ہمیشہ مجاہدوں اور سربازوں کی طرح ہیں کہ ایک ہی میدان میں مصروف جنگ ہیں اور وہ ہر وقت چوکنا رہتے ہیں کہ اگر کسی جانب سے اور کسی ایک مقام سے بھی دشمن کا آدمی رخنہ ڈالتا ہے تو وہ مل کر اس پر ایک سخت ضرب لگاتے ہیں۔

" تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ "

قرآن کہتا ہے:

اے انسان تو نقصان میں ہے مگر یہ کہ تو خود کو ایمان و عمل کے ساتھ ہم آہنگ کرلے، صرف اکیلے خود کو نہیں دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے سب ایک دوسرے کو اپنے ساتھ لیں۔

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ":

یعنی یہ کہ مومن سب ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ کسی مادی منافع کے لیے نہیں، بلکہ سب راہ حق کے ساتھ ہیں۔ میں ہمیشہ آپ کو حق کی وصیت و نصیحت کرتا ہوں اور آپ بھی مجھے کریں۔

یہ درست نہیں ہے کہ آج ہم وعظ کو صرف ایک خاص گروہ کا کام سمجھتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس انداز سے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ کوئی بھی شخص ہمیں دو باتیں نصیحت کی سنائے لازماً کوئی ایک شخص ہونا چاہیے جس نے برسوں عربی کے درس پڑھے ہوں۔ وہ عمامہ باندھے اور لازماً منبر پر بھی جائے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنے کے بعد وعظ شروع کرے۔

یہ بات نہیں ہے کہ ہم میں سے سب واعظ ہو جائیں (وتواصوا بالحق) لیکن ہمیں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنی چاہیے۔

دوسری توجہ طلب بات "ایک دشوار کام ہے اور یہ عمل ہر دوام کا مسئلہ ہے۔ اس پر توجہ دیجیے۔ سورہ مبارکہ ملک کی پہلی آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

"اللہ تعالیٰ نے موت اور زندگی پیدا کی اور تمھیں احسن العمل کی کٹھالی میں آزمائش کے لیے ڈالا۔"

ہمارے ائمہ نے قرآن کے اس نکتہ کو بیان کیا ہے کہ دیکھو:

"قرآن نے " اکثر عملا " نہیں فرمایا

یعنی عمل کے زیادہ ہونے کی بات نہیں کی بلکہ فرمایا

عمل احسن ہو۔ زیادہ اچھا ہو"

یعنی قرآن عمل کی کیفیت پر زور دیتا ہے، اس کی کمیت، مقدار پر زور نہیں دیتا۔ کیفیت کو پہلا درجہ حاصل ہے۔

ائمہ نے فرمایا:

"اَلْبَقَاءُ عَلَی الْعَمَلِ اَصْعَبُ مِنَ الْعَمَلِ"

"یعنی عمل پر ہمیشگی اختیار کرنا۔ خود عمل سے زیادہ دشوار ہے۔"

بسا اوقات آدمی میں ایک طرح کی ہوس پیدا ہوتی ہے اور کبھی افراد میں کار خیر اور اچھے کاموں کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی یہ ایک وقتی کیفیت ہوتی ہے بعد میں وہ ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں۔

حال ہی میں ایک شخص کے بارے میں، میں نے سنا کہ وہ اسلام کے راستے سے ہٹ گیا ہے۔ پھر اس کی ملاقات ایک مرد صالح سے ہوئی۔ اس مرد صالح نے اس شخص کو دوبارہ اسلام پر لانے کی کوشش کی اور وہ پھر اسلام کی راہ پر آگیا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے اسلام کی راہ پر اچھی پیش قدمی کی ہے یہاں تک کہ ہم اس کی حالت پر رشک کرنے لگے۔ پھر کچھ عرصے بعد ہم نے سنا کہ وہ عجیب طریقے سے الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ مجھے اس پر یقین نہیں آیا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ تو اب نماز بھی نہیں پڑھتا۔

راستہ کی مشکلات پر ایک دوسرے کی یاد دہانی کرنی چاہیے۔ اس راہ

ہیں صبر کی ضرورت ہے ، ثابت قدمی سے مقابلے کی ضرورت ہے۔ قرآن کہتا ہے:
اہل ایمان اور اہل سعادت ہمیشہ ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت کرتے رہتے
ہیں۔ میرے بھائی ۔ دامن صبر تیرے ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ تو حوصلت ہار۔
عمل پر ہمیشگی اختیار کر ، ثابت قدم رہ ۔ آگے راہ میں بہت زیادہ مشکلات ہیں۔

" وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ "

قرآن علاوہ اس کے کہ ایک دوسرے کو اساس حق اور اساس دین کی
وصیت کرتا ہے ۔ مشکلات کی جانب بھی توجہ دلاتا ہے:

" اَلْبَقَاءُ عَلَى الْعَمَلِ اَصْعَبُ مِنَ الْعَمَلِ "

کبھی شیطان انسان کو فریب دیتا ہے ۔ نفس امارہ انسان کو فریب دیتا ہے۔
آدمی اپنی ذات پر اعتماد کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ اب راہ حق سے نہیں پلٹے گا
جبکہ ہمارے سامنے بڑی بڑی مثالیں ہیں کہ لوگ فریب کھا گئے ۔ واپس پلٹ
گئے اور گمراہ ہو گئے ۔

ایمان اور عمل صالح جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے ، ایمان اور عمل صالح میں
تواصی بہ حق اور تواصی بہ صبر بھی شامل ہے اور وہ عمل صالح کا جزو ہیں ۔
لیکن قرآن نے مخصوص طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔

اے انسان !

تو ایک اجتماعی وجود ہے ، تو یہ خیال نہ کر کہ تو اپنے کمبل کو تنہا پانی
سے کھینچ کر نکال سکتا ہے۔ اگر تو اس آب اور غرقاب سے نجات حاصل کرنا چاہتا
ہے۔ تو اپنا ہاتھ دوسروں کے ہاتھ میں دے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بڑھو
اور رفاقت و شرکت کی طرف توجہ دو ۔ کیونکہ کام کو مکمل کرنا کام کے شروع کرنے
سے زیادہ دشوار ہے ۔

"یاایھاالذین آمنوااصبروا"

یعنی اے اہل ایمان صابر اور اپنے آپ پر قابو رکھنے والے اور جم کر مقابلہ کرنے والے بنو۔

"صابروا"

باب مفاعلہ سے ہے۔ یعنی آپ باہمی صبر اختیار کریں کہ وہ تجھے صبر کی نصیحت کرے اور تو اس کو صبر پر آمادہ کرے۔ تیرا صبر اس میں جھلکنے لگے اور اس کا صبر تجھ میں جھلکے۔ سب کا مقصد وہی 'تواصی بہ صبر' ہو۔ تو اس کو اپنے قول اور عمل سے صبر کی راہ پر بلا اور وہ تجھے اپنے قول وعمل سے صبر کی راہ پر قائم رکھنے کی کوشش کرے۔

"ورابطوا"

یعنی (جیسا کہ مفسرین اور تفسیر المیزان کے مفسر نے بیان کیا ہے) "رابطوا" وہی تواصی بہ حق ہے۔

اے مومنین! اپنے روابط کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط کرو۔

آج کل دنیا میں ایک چیز معمول بن گئی ہے، وہ حزب ہے "حزب" کا کیا مطلب ہے؟ افراد کے درمیان ایک باشعور رابطہ برقرار رکھنا۔ ایک دوسرے کو پہچاننا۔ اور ذمہ داریوں کو آپس میں تقسیم کرنا۔ حزب کا لفظ بھی قرآن سے تعلق رکھتا ہے۔

"فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ"

قرآن میں حزب الشیطان کے مقابل حزب اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ اس کے حقیقی معنیٰ روابط کے ہیں۔ یعنی تعلقات کو ایک دوسرے کے ساتھ مستحکم بنائیں اور ذمہ داریوں کو آپس میں تقسیم کریں۔

ذرا ان لوگوں کو دیکھیں:

چار جاسوس ہیں جو دین و مذہب کے نام پر جمع ہو گئے ہیں اور ان کے روابط اس قدر روشن اور برقرار ہیں کہ اگر آذربائیجان کے دیہات میں سے ایک دیہات کے کونے میں کوئی آدمی موجود ہو تو وہ اس بات سے واقف ہوتے ہیں کہ ان کے دائرے میں ایک ایسا شخص موجود ہے۔ اگر کسی روز تہران میں اس آدمی کی ضرورت پیش آئے تو اسے وہاں پہنچا سکیں لیکن اس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خود اپنی حالت سے بے خبر ہیں۔ اپنے ہمسایوں کی کوئی خبر نہیں رکھتے یہ بات قرآن کے دستور کے خلاف ہے۔

"ورابطوا"

یہ مضمون جو اس سورۂ مبارکہ میں سمویا گیا ہے وہ اس عصر، دور اور زمانے کی قسم سے تعلق رکھتا ہے جو دوسرے زمانوں کو جنم دینے والا اور ان کے لیے ماں کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شعاعیں پھینکنے والا زمانہ دوسرے زمانوں کی ماں بن سکتا ہے۔ اور اس کی شعاعیں اور اس کی شعاعوں کی لہریں دوسرے زمانوں تک پہنچتی ہیں اور اس طرح پہنچتی ہیں کہ آج ہم اس جلسے میں باہم بیٹھ کر دو چار چنی تلی باتیں جو کرتے ہیں تو اسی مبارک زمانے کی برکات میں سے ہے۔! "والعصر" اس نور پھیلانے والے بابرکت زمانے کی قسم! رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی قسم۔

انسان جب تک خود کو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ہم آہنگ نہ کرے گا خسران و نقصان میں رہے گا۔ انسان اسی اعتبار سے دوسری تمام موجودات کے ساتھ فرق رکھتا ہے۔

یہ مضمون کسی قدر وسیع ہے۔

انسان کی تعمیر کس چیز سے ہوتی ہے؟ کیا تنہا عمل سے یا تنہا ایمان سے یا باہم دونوں سے۔ کیا عمل ایک مطلق مفہوم کا حامل ہے اور ہر جگہ وہ ایک ہی شکل رکھتا ہے؟ یا لحظہ بہ لحظہ اس میں فرق پیدا ہوتا ہے؟ پانچ منٹ پہلے اس کی ایک صورت تھی اور پانچ منٹ بعد اس کی دوسری صورت ہوگی۔

ایک آدمی تالاب میں گر جاتا ہے اور بس غرق ہونے والا ہے۔ اس وقت نماز پڑھنا میرے لیے حرام ہے۔ مجھے چاہیے کہ میں فوراً جاؤں اور اس کی جان بچاؤں۔ اس لیے انسان کو اپنی ذمہ داری کا شعور ہونا چاہیے۔ وہ عمل صالح کو ہمیشہ پہچانتا رہے اور یہ جانتا رہے کہ اس لمحے میں سب سے اہم عمل کون سا ہے؟ اسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ وہ ایک انفرادی وجود نہیں ہے بلکہ اجتماعی وجود ہے۔

"وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"

اسے یہ جاننا ضروری ہے کہ کام کی تکمیل کے لیے صبر اور مقابلہ اور مداومت ضروری ہے۔ انسان کو بہت زیادہ صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ کہ نصرت الٰہی پہنچ سکے۔

امیرالمومنین کے ارشادات بڑے عجیب ہیں۔ بیان کی کوئی بلندی اس سے بہتر نہیں ہے:

> "انسان یہ سوچتا ہے کہ جب وہ پیغمبرؐ کے ہم رکاب ہے تو اسی ساعت اسے فتح حاصل ہو جانی چاہیے جب تک ہم میں سے ایک ایک آزمائش کی کٹھالی سے نکل کر باہر نہیں آگیا، جب تک ہم نے صبر نہیں کیا، جب تک ہم نے خود داری کا اظہار نہیں کیا۔ خدائے تعالیٰ نے اپنی نصرت ہم پہ نازل

نہ فرمائی"۔

پھر حضرت علیؑ بیان فرماتے ہیں:

"ہم نے ان مشرکین کے ساتھ کس قدر جنگ کی ہم کھڑے رہتے تھے اور مدافعت و مزاحمت کرتے تھے۔ "فمرۃ لنا و مرۃ لعدونا" یعنی کبھی ہم فتح پاتے تھے اور کبھی دشمن ہم پر غالب آجاتا تھا۔ "فلما رای اللہ منا الصبر" جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے صبر کی حقیقت کو ہم پر ظاہر اور عیاں دیکھا "انزل علینا النصر" اسی وقت اپنی نصرت ہم پر بھیج دی"۔

سورہ مبارکہ سجدہ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔

یعنی، اس قوم کے درمیان ہم نے اپنے رہبر مقرر کیے کہ وہ ہمارے فرمان کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

انھوں نے اس رہبری کی لیاقت کس طرح حاصل کی۔

"لَمَّا صَبَرُوْا"

انھوں نے پہلے صبر و ثبات اور خودداری کی صفت اپنے اندر پیدا کی۔

والسّلام

CULTURAL CENTRE OF THE ISLAMIC REPUBLIC OF IRAN
خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران
کراچی
... Road, Karachi

دار الثقافة الإسلامية
١٤٠٣هـ
پاکستان

[illegible]

ہماری مطبوعات

درس قرآن

مکتب تشیع اور قرآن

اسرار نہج البلاغہ

نہج البلاغہ سے چند منتخب نصیحتیں

مذہب اہل بیتؑ

شیعیت کا آغاز کب اور کیسے

فلسفۂ امامت

اہل بیتؑ آیۂ تطہیر کی روشنی میں

ائمہ سیرؑ (مختصر سیرت معصومینؑ)

سوانح حیات حضرت فاطمۃ الزہراؑ

اہل بیتؑ کی زندگی، مقاصد کی ہم آہنگی زمانہ کی نیرنگی

فدک تاریخ کی روشنی میں

آمریت کے خلاف ائمہ طاہرینؑ کی جدوجہد

صدائے حضرت سجادؑ

سوانح حیات حضرت امام حسینؑ

تفسیر سیاسی قیام امام حسینؑ

اثبات وجود خدا

۳۰ جواب

آسان عقائد (دو جلدیں)

تعلیم دین سادہ زبان میں (دو جلدیں)

حسینؑ شناسی

انقلاب حسینؑ پر محققانہ نظر

ذکر حسینؑ کی الف ب

تفسیر عاشورا

عزاداری کیوں؟

عاشورا اور خواتین

پیام شہیداں

ہمارا پیام

آزمائش

درس انقلاب

اسلامی تحریک قرآن وسنت کی روشنی میں

شناخت استکبار

عوامی حکومت یا ولایت فقیہ

کتاب المومن

خاندان کا اخلاق

ازدواج در اسلام

اسلام میں خواتین کے حقوق

آسان مسائل

عورت پردہ کی آغوش میں

اسلامی اتحاد مسلک اہل بیتؑ کی روشنی میں

مادیت و کمیونزم

خاک پر سجدہ، مقصد، اہمیت، حقیقت

مسجد، مقصد، تقاضے، ذمہ داریاں؟

عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز

دعائے افتتاح [illegible]

زیارت جامعہ